لہ دعوۃ الحق

قرآن و سنت کی تعلیمات کا علمبردار

فون نمبر دارالعلوم ــــ ۴ | فون نمبر دھائش ــــ ۲

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

جلد نمبر : ۷ | صفر المظفر ۱۳۹۲ھ

شمارہ نمبر : ۷ | اپریل ۱۹۷۲ء

مدیر

سمیع الحق

اس شمارے میں

نقشِ آغاز	سمیع الحق	۲
شراب اسلام کی نظر میں	مولانا انظر شاہ کشمیری	۶
پاکستان کی بربادی میں قادیانیت کا حصہ	مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہ	۱۷
قومی تعمیر اور ابلاغ عامہ کے ذرائع	مولانا کوثر نیازی بنام مولانا کوثر نیازی	۱۸
پاکستان کی تعمیرِ نو میں اسلام کی اہمیت	مولانا محمد اشرف صاحب ایم۔ اے	۲۲
میری علمی اور مطالعاتی زندگی۔ (سوالنامہ کے جواب میں)	مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع صاحب	۳۱
علماء کا اصل کام ـــــ اصلاحِ امت	شیخ الحدیث مولانا عبد الحق مدظلہ	۳۶
کیا عائلی قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہیں۔؟	مولانا قاضی عبد الکریم صاحب	۴۱
اسلام کا سوشلزم اور اسلامی تعلیم	ڈاکٹر محمد رفیع الدین ؒ	۴۷
نئی دنیا کی دریافت	مولانا محمد علی جوہر مرحوم	۴۸
مولانا مدنی ؒ کے اندیشے (افکار و تاثرات)	قاضی عبد الکریم صاحب	۴۹
مولانا سید احمد صاحب ؒ	قاری فیوض الرحمان ایم اے	۵۰
گستاخانہ رویہ پر اشکِ ندامت	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	۵۲
احوال و کوائف دار العلوم	ناظم دفتر اہتمام	۵۸
شیخ المحدثین نصیر الدین غور غشتی (عربی)	سمیع الحق	۶۰

مغربی و مشرقی پاکستان سے سالانہ -/۸ روپیہ، فی پرچہ ۷۵ پیسے۔ غیر ممالک بحری ڈاک ایک پونڈ، ہوائی ڈاک سے دو پونڈ

سمیع الحق استاد دار العلوم حقانیہ نے منظور عام پریس پشاور سے چھپوا کر دفتر الحق دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقشِ آغاز

قومی اسمبلی
سہ جماعتی معاہدہ
تعلیمی پالیسی
ہاکس بے

اگر خدا نے چاہا اور ملک کو کسی نئے بحران کا سامنا نہ کرنا پڑا تو ۱۴ اپریل کو قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوگا جس پر ملک کے کروڑوں مسلمانوں کی نگاہیں، دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ اس موقعہ پر قومی اسمبلی کے تمام ارکان عموماً اور برسراقتدار جماعت کی پوزیشن بڑی نازک ہے۔ قدرت نے انہیں ایک عظیم آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ انہیں ملک کو بحران سے نکال کر ترقی و خوشحالی اور پائیدار امن و اطمینان کے خطوط پر ڈالنا ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کی روشنی میں اسے پوری سنجیدگی، حقیقت پسندی اور مفاہمت کے ماحول میں اور خلوص و للہیت کے جذبہ سے بنیادی مسائل پر غور کرنا ہے اسلام سے غداری کا مزہ پورے ملک اور بالواسطہ پورے عالمِ اسلام نے چکھ لیا ہے۔ اگر اس زلزلۃ الساعۃ سے بھی ہمارا خمارِ غفلت نہیں ٹوٹ سکا۔ تو گویا ہم پر ایک ایسی موت طاری ہو چکی ہے جو یوم مکافات کیلئے صورِ اسرافیل ہی سے ختم ہو سکتی ہے۔ ملک کے بنیادی مسائل معاشی ہوں یا اقتصادی، زرعی اور معاشرتی ہوں یا تعلیمی سب کے اصلاح طلب ہونے پر پوری قوم متفق ہے۔ اختلاف طریق کار ہے۔ اگر ہم اس اختلاف کو ختم کرنا چاہیں اور ملک کو ایک ایسا آئین دینا چاہیں جو آئندہ بازیچۂ اطفال نہ بنے اور وہ واقعی معنوں میں ہماری تمام مشکلات، نظریاتی اختلافات اور فکری انتشار کا مداوا ثابت ہو سکے، تو یہ ضمانت ہمیں صرف اور صرف مکمل اسلامی قانون ہی دے سکتا ہے۔ ہر چند کہ اسمبلی کے پہلے اجلاس کا کام صرف عبوری آئین کی منظوری دینا ہے۔ مگر چند باتیں ایسی ہیں جن سے بے اتفاقی اور گریز ملک کو آئندہ ہولناک ترین بحران اور فکری انتشار میں ڈال سکتا ہے۔ اس لئے ان پر تمام ارکان اسمبلی کا مکمل اتفاق رائے ہونا چاہئے۔ ۱۔ آئین کی کوئی دفعہ نہ صرف یہ کہ کتاب و سنت کے مخالف نہیں ہوگی بلکہ مثبت طور پر یہ ضمانت بھی ضروری ہے کہ ہر دفعہ قرآن و سنت کے مطابق ہو۔ ۲۔ تمام قانون سازی کتاب و سنت کی روشنی میں کی جائیگی۔ ۳۔ اس اسلامی اسٹیٹ کی صدارت اور دیگر کلیدی مناصب (انتظامیہ، عدلیہ، بحری، بری، فضائی افواج) سمیت کسی منصب پر غیر مسلم فائز نہیں ہو سکے گا۔ ۴۔ مسلم کی تعریف وہی ہوگی جو مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے ان مسلمات دین کو ملحوظ رکھ کر ہر دور کے معتمد علیہ علماء کرتے چلے آئے ہیں۔ ۵۔ بنیادی جمہوری حقوق کی حفاظت۔ ۶۔ عدلیہ کی اسلامی خطوط پر ترتیب، انتظامیہ پر اس کی برتری اور مکمل آزادی۔ ۷۔ مارشل لاء کا دائمی خاتمہ۔

قدرت نے ہمارے معزز ارکان کے کاندھوں پر نہایت ناساعد حالات میں گرانبار ذمہ داریاں ڈال دی ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سے اس اسلامی جمہوریہ اور اس کے عوام کی توقعات کتنی پوری ہو سکیں گی۔ حق تعالیٰ

پردۂ غیب سے صلاح و فلاح کے اسباب ظاہر فرما دے اور اپنی دستگیری سے اس اجلاس کو خیر و بھلائی اور نہایت دور رس برکات کا ذریعہ بنا دے۔ وما ذٰلک علی اللّٰہ العزیز۔

جمعیۃ العلماء اسلام، پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کا باہمی سمجھوتہ ملک کے ہر طبقہ میں سراہا گیا، سقوطِ مشرقی پاکستان نے حالات اور سیاست کا رخ بدل دیا اور جو لوگ اپنی مخلصانہ صوابدید کی بناء پر اس اتحاد پر چیں بجبیں ہو سکتے تھے، اب اس مفاہمت اور سمجھوتہ کو ملک کی سالمیت اور بقاء کا ذریعہ سمجھ کر اس پر اطمینان کا اظہار کر رہے ہیں۔ ہمیں نیشنل عوامی پارٹی کے عمائدین کی بہ تکرار ان یقین دہانیوں پر بے حد خوشی ہے جس میں جمعیۃ العلماء اسلام کے ۷ نکاتی پروگرام کا احترام رکھنے کی یقین دہانی کی گئی ہے۔ اس پروگرام کی پہلی شق صوبوں میں اسلام کے ماتحت قانون سازی اور مرکزی مجلس مقننہ میں اسلامی آئین کے بارہ میں جمعیۃ کی حمایت ہے اور مزید مسرت خان عبدالولی خان صاحب کے ان الفاظ سے ہے جو انہوں نے دستور سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہے اور فرمایا "کہ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ نیپ نے اکثریت کے باوجود جمعیۃ کو صوبہ سرحد میں وزیر اعلیٰ مقرر کرنے کا حق اس لئے اختیار دیا ہے کہ ہم اس ملک میں اسلامی معاشرہ چاہتے ہیں۔ (نوائے وقت ۱۲ مارچ) سیکولر ریاست کے بارہ میں نیپ کے سربراہ نے اپنے موقف میں جس خوش آئند تبدیلی کا اعلان کیا ہے۔ ہم اُسے بھی اکابرین جمعیۃ کی مدبرانہ سیاست اور اس اتحاد و اشتراک کا ثمرۂ خیر سمجھتے ہیں۔ اب جبکہ سرحد میں اس اتحاد کی رو سے جمعیۃ العلماء اسلام کو وزارت سازی کا موقعہ مل رہا ہے، تو ملک کے تمام مخلص دیندار اور دین کے وعویدار افراد اور جماعتوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے گرد بیجا شکوک و شبہات کا حصار کھینچنے کی بجائے اسے اسلام کے نشأۃ ثانیہ اور مثالی معاشرہ کا پیش خیمہ سمجھ کر اسکی کامیابی کے لئے دست بدعا ہوں۔ کیا عجب یہ سہ جماعتی معاہدہ شمال مغربی سرحدی علاقوں میں دینی اقدار کے فروغ اور فواحش و منکرات کے ازالہ کا ذریعہ بن جائے اور جو سرزمین سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء کے خونِ شہادت سے لالہ زار بنی وہ آج سیدین شہیدین کے خوابوں کی تعبیر اور شیخ الہند محمود الحسن دیوبندی کے سپنوں کی آماجگاہ بن جائے — ھذا تأویل رؤیای من قبل قد جعلها ربی حقا۔

صدیوں بعد کسی خطہ میں علماء حق کا برسر اقتدار آنا جتنی مسرت کی بات ہے۔ حالات اور زمانہ کے لحاظ سے اتنی ہی نازک ترین آزمائش بھی ہے۔ ہمیں اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، تعلیم ہر میدان میں بتدریج تبدیلیاں لانا ہیں۔ اسکی صورت اور طریق کار کیا ہو۔ ؟ الاہم فالاہم کے مطابق کونسی باتیں اوّلین اور کونسی چیزیں ثانوی اہمیت کی حامل ہونگی اور ہمیں دینی اصلاحات کے سلسلہ میں دین سے عمومی گریز کی فضاء میں

بین المملکتی حدود میں رہتے ہوئے کس طرح اسلامی نظام حکومت کو اپنانا ہوگا۔؟ یہ اور اس قسم کے بیشمار مسائل جمعیۃ العلماء اسلام کے اکابر اور خاص طور پر اس کے اولوالعزم اور مدبر قائد مولانا مفتی محمود صاحب کے سامنے ہیں۔ اسلامی خلافت راشدہ کی آرزو اگر صرف جمعیۃ کی نہیں بلکہ تمام دردمند مسلمانوں اور جماعتوں کا مرکز تمنا ہے تو آیئے سب بڑھ کر اس حسین تصور کو جامۂ حقیقت پہنانے میں جمعیۃ العلماء اسلام کا ہاتھ بٹائیں اور اپنی تمام خداداد قوت اور وسائل سے اسکی پشت پناہی کریں۔ اسطرح اللہ کی رحمتیں ہمارے ساتھ ہونگی۔ اس مرحلہ پر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اپنے محبوب قارئین کو بھی اس دعا میں شریک کرا دوں۔ معزز قارئین آیئے سب بارگاہ ایزدی میں ہاتھ اٹھا کر خلوص دل سے دعا کریں کہ بار آلہ مدتوں بعد جب تو نے اپنے بندوں کی ایک جماعت کو ایک مختصر سے خطہ میں اس نعمت سے نوازا کہ وہ وہاں تیرے دین کا بول بالا کر سکیں تو اب انہیں توفیق بھی عطا فرما کہ وہ اس پُرخطر اور سنگلاخ وادی سے سرخرو ہو کر کامیابی سے ہمکنار ہو جائیں۔ یہاں کے چپہ چپہ میں منکرات اور برائیوں کی بجائے نیکی اور بھلائی کا دور دورہ ہو۔ اگر تو نے یہ نازک ذمہ داری جمعیۃ العلماء اسلام کے کاندھوں پر ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو اب ہر طرح ان کی دستگیری بھی فرما اور ان لاکھوں اسلام کے نام لیوا شیدائیوں کی آنکھوں کو ٹھنڈا کر جو صدیوں سے خلافت راشدہ کا نمونہ اور اسلامی معاشرہ دیکھنے کو ترس رہی ہیں۔

زندگی کے مختلف شعبوں میں صدر محترم نے نہایت اہم تبدیلیوں کا اعلان کیا ہے، ان اصلاحات سے مشکلات اور خرابیوں کا کس حد تک ازالہ ہو سکے گا۔ اور اسکی شرعی یا غیر شرعی حیثیت اور موثر ہونے یا کس حد تک ہونے کے بارہ میں ہم اپنی رائے محفوظ رکھتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی کے بارہ میں اتنا عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس پالیسی سے وہ توقعات پوری نہیں ہو سکتیں جو ملک و ملت کو اسلامی سانچہ میں ڈھالنے کے لحاظ سے نظام تعلیم اور تعلیم سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ ہر چند کہ صدر محترم کا ارشاد ہے کہ ہم دین اسلام کی روح اور دینی اقدار کو تعلیمی نظام میں سمو دینا چاہتے ہیں۔ مگر اس کی روشنی میں جب طویل الذیل تعلیمی پالیسی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہو جاتی ہے نہ صرف بحیثیت مسلم قوم بلکہ حالیہ ذلیل ترین شکست کے بعد ایک شکست خوردہ قوم کی حیثیت سے ہمیں تعلیمی پالیسی اس بنیاد پر بنانی تھی کہ پورا تعلیمی نظام فرد اور معاشرہ کی اخلاقی اور ایمانی تربیت کا ذریعہ بن جاتا، وہ مایوسی کی بجائے ولولہ، شک اور اضطراب کی بجائے ایمان و یقین خود فراموشی کی بجائے ضبط نفس کا موجب بنتا جو ایک بلند و برتر پاکیزہ اجتماعی مقصد اور اس کے لئے والہانہ جوش اور ولولہ سے سرشار کر کے قومی یکجہتی، اتحاد اور یگانگت کا ذریعہ بن سکتا اور وہ واضح حسین اور شفاف تصور حیات قوم کے منتشر شیرازہ کو ایک لڑی میں پرو دیتا اور جو

اندر سے ایمان ویقین اور اخلاقی اقدار کی لہریں ابھار کر ہماری تمام اخلاقی ومعاشرتی اور طبقاتی ناہمواریوں کا مداوا بن جاتا اور یہ سب کچھ تب ہوتا کہ ہم ایمان ویقین، خدا، رسول، اسلام اور شریعت کو پوری تعلیم کا محور بنا دیتے۔ طبعیات، حیاتیات اور نفسیات کی کتابوں کو خدا کے تصور کے دائرہ میں لے آتے سائنس کو مذہب کا خادم بنا کر پیش کرتے، مادیات کو آخرت کا وسیلہ قرار دیتے، طالب العلمانہ دور کو نہ صرف تعلیم بلکہ ایک مہذب مسلمان شہری کی تربیت کے لئے غنیمت سمجھ لیتے۔ اس طرح ملک کی تعمیر ہو سکتی۔ انارکی اور جنسی ومادی طغیانیوں میں ڈوبتا ہوا معاشرہ ساحل مراد سے ہمکنار ہو جاتا، تعلیمی پالیسی بامقصد ہونے کی صورت میں اخلاقی تربیت، تہذیب نفس کا ذریعہ بنتی اور پوری قوم کو متحد بنا کر اسے اجتماعی عمل اور جدوجہد پر اکساتی اور صحیح معنوں میں ایک اسلامی انقلاب برپا ہو سکتا۔

کراچی کے ہاکس بے پر جو شرمناک واقعہ رونما ہوا، اخباری اطلاعات کی بنا پر اس سے صدر مملکت سے لیکر قوم کے عام افراد تک کی آنکھیں شرم سے نیچی ہو گئیں اور واقعی سینکڑوں جوان لڑکوں کا سینکڑوں لڑکیوں پر ٹوٹ پڑنا اور بھوکے کتوں کیطرح انہیں نوچنا اور بھنبھوڑنا ایک دوسرے پر ہلہ بولنا، الغرض قوم کی شرم وحیاء کا جنازہ اس شان سے ہاکس بے کے ساحل پر سمندر میں ڈبو دینا۔ خود شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ مگر کیا واقعی ہماری نگاہیں شرم سے نیچی ہو گئی ہیں۔ یا شاید یہ بھی ایک رسمی حیاداری کا مظاہرہ ہے۔ ہم ہاکس بے کی حیاباختہ نوجوان پود کو کوستے ہیں۔ مگر یہ واقعہ تو پوری قوم کی ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ تم انہیں کوستے ہو تو اپنی عقل وخرد کا ماتم کیوں نہیں کرتے، تمہیں صرف اُن "شریف زادیوں" سے ہمدردی کیوں ہے جو مادر پدر آزاد بن کر آوارہ نسلوں کیلئے سامانِ تفریح بننے ہی کیلئے پکنک منانے تفریحی ساحلوں پر جاتی ہیں۔ اگر کوسنا ہے تو دونوں کو کوسو اور اگر ہمدردی کے مستحق ہیں تو لڑکیوں کیساتھ لڑکے بھی کہ ہم ہی ان کے اخلاق اور شرم وحیاء کے قاتل ہیں۔ ہم ہی نے انہیں ہوسناکی اور حیوانیت کے اس ہلاکت آفرین راستہ پر ڈال دیا ہے۔ شرم سے آنکھیں نیچی کرنے والے بزرگو! ذرا آنکھیں اٹھا کر تو دیکھو تمہارے تعلیمی اداروں میں کیا پڑھایا جاتا ہے اور کن کن عملی تجربات کی لیبارٹریوں سے قوم کی نئی پود گذاری جا رہی ہے۔ اور وہ دیکھو فلم کا پردۂ سیمیں وہ تو "قومی ترقی" میں بنیادی کردار ادا کر رہا ہے۔ اور وہ جب ٹی وی پر نوجوان پود پرانی نسل کی داڑھیاں نوچ رہی ہوتی ہے تو تمہارا جذبۂ غیرت کہاں مرچکا ہوتا ہے۔ اور تمہاری جبین غیرت ریڈیو پر فحش مبتذل گانے سن سن کر اور سنا سنا کر کبھی عرق آلود نہیں ہوتا۔ پھر جب آگ اور پانی کو یکجا کرنے کا نتیجہ اس شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے تو تمہاری آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں۔ میری نگاہیں تو اس واقعہ سے نہیں بلکہ عمائدین اور سرِ فلین قوم کے اس اعترافِ شرم پر شرم کے مارے جھک گئی ہیں کہ ؎

درمیاں قعرِ دریا تختہ بندم کردہ
بازمی گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل

سمیع الحق

عظیم اسلامی مملکت کی بربادی کی ذمہ دار

شراب

اسلام کی نظر میں

اے صدرِ محترم ایک نگاہ اس پر بھی ۔ (ایڈیٹر)

شراب اور دماغی امراض | شراب سینکڑوں قسم کے دماغی امراض پیدا کرتی ہے اس کا انکار بھی حقائق و واقعات کے انکار کے مترادف ہوگا۔ مے نوش جن دماغی عارضوں میں ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں، اس کا اظہار اطبّا اور حاذق معالج آئے دن کیا کرتے ہیں، اور اس ہلاکت عظیم کو شراب کی دوسری مضرتوں میں زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں کہ:

خداوندِ عالم نے شراب میں کوئی شفا نہیں رکھی وہ دماغ کو جو مرکزِ عقل ہے۔ شدید نقصان پہنچاتی ہے۔ فقہاء اور اطباء سب اسے تسلیم کرتے ہیں۔	ما جعل الله لنا فيها شفاء قط فانها شديدة المضرة بالدماغ الذي هو مركز العقل عند الاطباء والفقهاء۔ (زاد المعاد جلد ۳)

طب یونانی کا سب سے بڑا ماہر اور حاذق طبیب جس کے تجربات و حذاقت پر یونانی طب کے علاوہ ڈاکٹری میں بھی بڑا اعتماد ہے اور یورپ کی مخصوص طب، صدیوں کے روشن تجربات کے باوجود بقراط کی فنی مہارت کا انکار نہ کرسکی۔ یہی دنیا کا مایۂ ناز طبیب "بقراط" کہتا ہے کہ:

ضرر الخمر بالرأس شديد	شراب کا سب سے زیادہ ضرر دماغ کو پہنچتا ہے۔
وهو كذالك بالذهن۔	اور ایسا ہی ضرر اس سے ذہن کو پہنچتا ہے۔

صاحب "الکامل" نے بھی لکھا ہے کہ:

انّ خاصة الشراب الاضرار بالدماغ والعصب۔

یعنی شراب کی خاصیت ہے کہ وہ دماغ اور پٹھوں کو شدید نقصان پہنچاتی ہے۔ بقراط کی طبّی حذاقت

پر اعتماد کے بعد شراب کی مضرت کے سلسلہ میں کوئی وجہ نہیں کہ اس کی رائے پر اعتماد نہ کیا جائے۔ لیکن دورِ حاضر کا ذہن جس طرح یورپ کی تحقیقات پر اعتماد کرنے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اسی کی ساخت کا تقاضہ ہے کہ اس سلسلہ میں یورپ کے پیش کردہ ان اعداد و شمار کو بھی دیکھ لیا جائے جو افراد مے نوشی کی سوسائٹیوں کی جانب سے شراب کی دماغ پر مرتب ہونے والی مضرتوں کے سلسلہ میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ بلجیم میں کثرتِ شراب نوشی کے نتیجہ میں جو ہولناک تباہ کاریاں رونما ہو رہی ہیں ان کو دیکھئے۔ لکھا ہے کہ:

"مجرموں میں فی صدی اسّی خودکشی کرتے ہیں۔ ۷۰ قید خانے میں رہتے ہیں۔ ۹۰ فقر و فاقے میں بسر کرتے ہیں۔ اور ۷۵ فیصد فیصدی مجنون اور پاگل ہیں۔" (احکام العقلیہ ص۸۵)

اور دنیا کے سب سے زیادہ مے نوش ملک اور عشرت کدۂ یورپ یعنی فرانس میں اسی زہر سیال کی ہلاکت خیزیاں اسی طرح سامنے آئیں۔

"کثرتِ مے نوشی سے جو دو خاص مرض، ایک مرض دماغی سرسام کا اور دوسرا جگر کی خرابی کا پیدا ہوتے ہیں، اس سے مرنے والوں کی تعداد "فرانس" میں ۱۹۳۶ء سے ۱۹۵۲ء تک ۱,۹۰,۰۰۰ کو پہنچی، اور اسی مدت میں فرانس جو انڈو چائنا میں جنگ کرتا رہا اس جنگ میں اس کے مرنے والوں کی تعداد ۱۹,۰۰۰ کی رہی اور یہ شمار تو ان امراض سے براہِ راست مرنے والوں کا رہا، باقی جو لوگ کثرتِ مے نوشی سے بالواسطہ مرتے ہیں۔ یعنی اس کے اثرات سے بالواسطہ ان کی میزان اگر لگائی جائے تو تعداد اس کی بھی دس گنی پڑے گی۔ (بمبئی کرانیکل ۱۹۵۴ء)

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مے نوشی کی کثرت اور جامِ زہر کے پرکیف نائو نوش کے نتیجہ میں مرنے والوں کی تعداد جنگ ایسی ہلاکت انگیز و تباہ کن چیز سے بھی آگے بڑھ گئی۔ اور جنگ بھی چار سو پانچ سو سال قبل کی نہیں۔ جبکہ تیر و تفنگ اور شمشیر و سنان سے کام لیا جاتا تھا۔ بلکہ ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے زمانہ میں جس سے "ہیروشیما" ایسے آباد و پُر رونق آبادی اور حسین شہر کو چند منٹ میں تودۂ خاک بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔ اور ہزارہا بلکہ لاکھوں انسانوں کو دیکھتے ہی دیکھتے خاک و خون میں تڑپنے کے لئے اور خونخوار انسان نما بھیڑیوں کی داستانِ ظلم و عدوان سنانے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ فرانس کے اسی عشرت خانے میں جہاں شراب نوشی کے لئے آبادی کا ذرّہ ذرّہ سمٹ کر شراب خانوں میں پہنچ جاتا ہے۔ دماغی امراض اور جگر کی خرابیوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۱۹۵۳ء میں ۳۹۰۵ اور ۱۹۵۴ء میں ۱۰۶ ,۴ تھی۔" (صدقِ جدید ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۵ء)

انسدادِ مے نوشی کے ان اعداد و شمار سے معلوم ہوا ہوگا کہ شراب سے دماغی امراض اور عارضے کس طرح اور کن مہلک صورتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ دماغی بیماریاں اکثر

جنون | کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ دماغ کے ضعیف اور ماؤف ہو جانے کے بعد جنون کا عارضہ قطعاً متوقع ہے۔ ہندوستان کا مشہور افسانہ نگار اور فحش نویس "منٹو" بارہا جنون میں مبتلا ہو کر پاگل خانوں تک پہنچا۔ اس برگشتہ قسمت افسانہ نویس کی موت پچھلے دنوں جن عبرتناک حالات میں ہوئی وہ خود ایک المناک افسانہ ہے، شراب سے پیدا ہونے والے جنون کے سلسلہ میں یورپ کا ڈاکٹر "بنیم" لکھتا ہے کہ:

"افریقہ کے جن لوگوں نے شراب کا استعمال کیا وہ پاگل ہو گئے اور یورپ کے جو باشندے اسکی کثرت رکھتے ہیں وہ بھی جنون کے بیمار ہیں۔ اس لئے شراب کو جلد از جلد افریقیوں کے لئے ممنوع مشروب قرار دیا جائے۔" (طنطاوی ص ۱۹۲)

جگر کی بیماری | دماغ کو شدید نقصان پہنچانے کے ساتھ جگر کو بھی اس کی مضرتیں تباہ کرتی ہیں، حالانکہ جگر بھی اعضائے رئیسہ میں ایک ایسا عضو ہے۔ جس پر جسمانی صحت کا دار و مدار بڑی حد تک ہے۔ خون صالح تیار کرنے کے بعد تمام اعضاء کو ان کی مناسب خواہش کے تحت سپلائی کرنے کا کام قدرتی طور پر یہی عضو رئیس انجام دیتا ہے۔ جن مریضوں کے جگر خون بنانے کا کام چھوڑ دیتے ہیں۔ اُن کی صحت جسمانی بالکل مضمحل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور اطباء و معالجین اس کے علاج و معالجہ میں خاص احتیاط اور غور و پرداخت کی ہدایت کرتے ہیں۔ لیکن آتشِ سیال اسی کارآمد اور جسم کے فعال عضو کو ماؤف کر دیتی ہے اور صرف ایک ملک میں اسکی ہلاکت خیزیوں کی سالانہ رپورٹ یہ ہے:

"کثرت مے نوشی سے ۱۹۵۳ء میں جگر کی بیماری میں ۱۱۰۷۰ نفوس ہلاک ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں اسی جگر کی بیماری میں مرنے والوں کی تعداد ۱۲۷۰۱ ہوئی۔"

بندشِ شراب کے ان باخبر اداروں کے ان اعداد و شمار کی روشنی میں فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ مہلک مشروب جگر کو کس طرح نقصان پہنچا کر نہ صرف لبِ گور بلکہ ہلاک ہی کر کے چھوڑتا ہے۔ ریاست ٹونک کا مشہور سلمیٰ پرست "شاعر اختر شیرانی" جیسے اس کے دوستوں نے شراب کی عادت ڈال کر عالم شباب ہی میں تباہ و برباد کیا۔ سوانح نگار نے لکھا ہے کہ:

"شراب نے ان کے جگر کو بھون دیا تھا اور جسمانی صحت کے پرخچے اڑا دئیے۔"

(نقوش شخصیات نمبر ۲ ص ۹۰۰)

یہاں تک کہ مے نوشی کی کثرت کی وجہ سے یہ نوجوان شاعر لاہور میں ہلاک ہوگیا۔ شراب نوشی سے پیدا ہونے والے امراض خصوصاً عارضہ جگر کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"لیل و نہار اسی طرح گذر رہے تھے ایک دن آپ پر ردعمل کی کیفیت طاری ہوئی، جس کے نتیجہ میں غثیان و تہوع کی حالت بڑھ گئی، قبض شدید ہوگیا، جگر نے جواب دے دیا اور آنکھوں پر زردیاں چھاگئیں، مجبوراً میں نے انہیں "میو ہسپتال" میں داخل کرایا۔ وہاں پہلے تو کچھ روز ٹھیک رہے، اچانک ایک روز زیادہ طبیعت بگڑ گئی اور بالآخر ۴۴ سال کی عمر میں ۹ ستمبر ۱۹۴۰ء کی دوپہر کو اپنے وقت سے پہلے زندگی کی دشوار گذار راہوں کا سفر ختم کر لیا" (ایضاً)

پچھلے دنوں بادہ پرستی کا ہولناک انجام "مجاز" کی موت کی صورت میں سامنے آیا اور "منٹو" کی عبرت انگیز موت کی تفصیلات اخبار بین طبقہ کو معلوم ہیں۔

سکتہ کی بیماری | بادہ نوشی کے نتیجہ میں ایک اور مہلک بیماری "سکتہ" بھی جان لیوا روگ ثابت ہوتا ہے۔ سستی اعصاب، تشنج اور رعشہ کے بعد سکتہ کا خطرناک عارضہ لاحق ہو کر ہلاک کر دیتا ہے، طب یونانی کی ایک مشہور کتاب میں ہے کہ :

"شراب ذہن کو بلید کر دیتی ہے، اعصاب کو سست، رعشہ اور تشنج پیدا کرتی ہے اور اکثر شراب پینے والے سکتہ کی بیماری میں ہلاک ہوتے ہیں۔"	تبلد الذھن ویرخی الاعصاب ویورث الرعشہ ویورث التشنج وکثیراً ما یموت السکران بالسکتہ۔

(نفیسی صفحہ ۲۲۷)

ضعف قلب | صحت انسانی کے قیام و بقا میں جہاں اور اعضائے رئیسہ کو دخل ہے ان میں سب سے زیادہ قلب کی طبعی حرکت کو انسانی زندگی کی بقاء کا دارومدار بتایا گیا ہے۔ اس عضو رئیس کی حرکت سے انسانی زندگی تعبیر ہے۔ اندرونی نظام کی یہ متحرک گھڑی جہاں بند ہوئی تو انسان کی موت واقع ہوتی ہے۔ اسکی حرکت میں اختلال خطرناک آغاز ہے۔ مصنف نے جسمانی زندگی کے نظام میں قلب کو جو اہمیت ہے اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"صحت جسمانی کا مدار، قلب کی حالت و کیفیت پر ہے اگر قلب اور دموی رگیں صحیح حالت پر نہ ہوں گی تو ان سے متعلق تدرتی عمل پورا نہ ہو سکے گا۔ اور جسمانی صحت کا پورا نظام شکست و ریخت ہو جائے گا۔" (الحیوۃ والخمر صفحہ ۵)

مصنف نے قلب سے مربوط شریان وعروق کی تفصیل اس کی طبعی رفتار پر مے نوشی کے مہلک اثرات کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

اطباء نے اسی وجہ سے کہا ہے کہ جب شراب جسم میں داخل ہوگی تو قلب کو ضعیف کر دے گی. قلب اور اس سے متعلق اعصاب میں شدید مضرتیں رونما ہوں گی۔

ومن ھنا ثبت للعلماء ان الکحول اذا دخل الجسم ادّی الی اضعاف القلب واثر فیه وفیما یتصل به من الاعصاب تاثیراً تاماً۔ (ص۵۵ ایضا)

...

اور یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوگا کہ جب ۲۴ گھنٹہ کے عرصہ میں شراب پینے والا ۱۶ ونیہ (تقریباً ۱۸ تولہ) شراب استعمال کرے گا. تو قلب کی حرکت جو ایک گھنٹہ میں ۴۲۷۴ مرتبہ ہونی چاہیئے تھی، طبعی حرکت سے بڑھ جائے گی اور ایک سکنڈ میں ۱۲ مرتبہ حرکت ہوگی۔ یہ حرکت قلب کی معمولاً رفتار سے زیادہ ہے اور مے نوشی کا خطرناک نتیجہ ہے. اور پھر کچھ مدت میں غیر طبعی مسلسل حرکت، قلب کو ضعیف کر دے گی۔ جیسا کہ مصنف نے لکھا ہے کہ:

وقد ثبت ان ادمان المشروبات الکحولیه یؤدی شیئاً فشیئاً الی استرخاء القلب وتمدد عضلته۔

مسکرات کے پینے سے قلب سست پڑ جائے گا اور عضلات ڈھیلے پڑ جائیں گے۔ (الخمر والحیٰوۃ ص۵۸)

چنانچہ اسی ضعف قلب کے نتیجہ میں جو عموماً شراب نوشوں کو عارض ہوتا ہے. نوے فیصدی اموات واقع ہو رہی ہیں اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

"علاوہ ازیں آجکل حرکت قلب بند ہونے سے اسقدر زیادہ موتیں واقع ہو رہی ہیں کہ کسی اور مرض سے اتنی نہیں. ایک اندازے کے مطابق ایسی موتیں ۹۰ فیصدی شراب نوشی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ (انسانیت حیوانیت کی راہ پر ص۲۲۶)

گلے کی خرابی حاذق اطباء اور تجربہ کار ڈاکٹروں کا فیصلہ ہے کہ شراب گلے کو بھی سخت نقصان دیتی ہے جسکی وجہ سے نہ صرف آواز بیٹھ جاتی ہے. بلکہ گلے میں دائمی خراش، مسلسل کھانسی قائم ہو کر "سل" جیسے موذی مرض کا پیش خیمہ بن جاتی ہے. لکھا ہے کہ :

"شراب پینے والے کے گلے میں التہاب و تہیج پیدا ہو جاتا ہے جس سے ہوا کی نالیاں بگڑ جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ شرابی عموماً کھانسی کے مریض رہتے ہیں۔ اور

ان کی آواز میں خشونت پیدا ہو جاتی ہے، جب بولتے ہیں تو سخت آواز کے ساتھ اور لبا اوقات پھیپھڑا کی بیماری اور سانس کا مرض "سل" ایسے خوفناک مرض کا باعث ہوتا ہے۔" (الخمر والحیوۃ ص ۵۳)

ہندوستان کے ایک مشہور شاعر گلے کی جن شدید بیماریوں میں مبتلا تھے۔ کیا عجب کہ ان امراض کے پیدا کرنے میں اسی زہر کی سمیات کو دخل ہو۔

فتورِ ہضم | شراب کے فوائد بیان کرنے والے کہتے ہیں کہ غذا شراب سے خوشگوار ہو کر زود ہضم بن جاتی ہے۔ اس لئے شراب کا استعمال مفید ہوگا۔ حالانکہ اس شعبہ میں بھی رائے یہی ہے کہ شراب فتورِ ہضم کا باعث بنتی ہے اور قوتِ ہضم کو سست کر کے اس کے صالح نظام کو درہم برہم کرنے میں اس کو کافی دخل ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ:

"شراب ہضمِ طعام کے سلسلہ میں بے حد مضر اور مہلک ہے اس لئے کہ یہ معدہ میں پہنچ کر غیر معمولی گرمی اور ہیجان پیدا کرتی ہے۔ یہ تھیج بہت سے امراض پیدا کرتا ہے اور اشتہا کو ساقط کر دیتا ہے، غذا کے کم ہونے پر جسم کو غذا کی اتنی مقدار نہیں پہنچ سکتی جتنی کہ وہ اپنے نظام کو چلانے کے لئے چاہتا تھا، اور غذا کا جو قلیل حصہ پہنچتا بھی ہے تو ہضم کے فتور کی وجہ سے بجائے مفید ہونے کے وہ بھی مضر ہوتا ہے۔"

(الخمر والحیوۃ ص ۱۹)

شراب میں منافع ثابت کرنے والے برابر کہہ رہے ہیں کہ اس آتشِ سیال میں غذائی اجزاء بھی ہیں جو تحلیل ہو کر جسم کے لئے بہترین غذا بن سکتے ہیں، شراب میں غذائیت کی تردید کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ:

"شراب میں ایسے اجزا نہیں ہیں جو غذا کا کام دے سکیں، بلکہ یہ تو جسم کی طاقت کو سلب کرنے والی شے ہے، غذا کا کام اس سے نہیں لیا جا سکتا۔" (ایضاً ص ۱۹)

حالانکہ ہضم کا فتور بلکہ ہاضمہ کا معمولی اختلال و فساد بھی جسمانی صحت کے لئے زبردست مفسدہ ہے جسمانی صحت کی عمارت ہضم کے صالح نظام پر موقوف ہے، غذا اگر ٹھیک طور پر ہضم نہ ہوگی تو جسم کے تمام اعضاء ضروری اور صالح خون ہے کے حاصل کرنے سے محروم رہیں گے، جس کے نتیجہ میں پوری صحت و تندرستی کا ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اور طاقت و قوت کے نہ ہونے سے آدمی نکما ہو کر نہ صرف اہل وعیال، قبیلہ و خاندان کے لئے بلکہ معاشرہ اور سوسائٹی کے لئے بار ثابت ہوگا۔ ہضم کے پورے نظام کا اختلال درکنار معمولی سا

سوء ہضم بھی انسان سے سرور نشاط کل کو چھین لیتا ہے، معطل زندگی اپنے لئے بھی مصیبت اور معاشرہ کے لئے بھی بلائے بے درماں، بہرحال معلوم ہوا کہ شراب سے قوت ہضم بے حد کمزور اور سست پڑ جاتی ہے۔ چہ جائیکہ اس سے استمرار طعام وغیرہ کا کام لیا جائے، بعض شراب نوش "بیئر" میں خاص طور سے غذائیت کے قائل ہیں۔ اگر بیئر میں غذائیت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو معمولی غذائیت ان عظیم نقصانات کے مقابلہ میں کیا حیثیت رکھتی ہے۔ جو نقصانات شراب نوشی سے پیدا ہونے والے ہیں۔ اور پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ صالح، غیر مضر اور ارزاں غذاؤں کو چھوڑ کر مضر اور گراں قیمت بیئر کو خرید کر پیا جائے مصنف نے بھی لکھا ہے کہ:

"کس قدر کھلی ہوئی حماقت اور فضول خرچی ہے کہ آدمی بطور غذا کے بیئر کی کثیر مقدار استعمال کرے۔" (ایضاً ص۴)

یعنی بیئر کو خرید کر پینے والے سوائے حماقت و سفاہت کے اور کس بات کا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔

جسم کی حرارت ختم ہو جاتی ہے | ایک فائدہ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ شراب نوشی سے جسم میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے جدوجہد کی تحریک اور کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر بادہ پرستوں کا یہ انتہائی اعلیٰ مشروب "فعال" بنانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس دعوے میں کہاں تک سچائی اور واقعیت ہے۔ اسی کا انکشاف کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ:

"اکثر پینے والے کہتے ہیں کہ شراب جسم کی حرارت بڑھا کر برودت کو زائل کر دیتی ہے۔ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور کہنے والے حقیقت سے قطعاً ناآشنا ہیں۔" (ایضاً ص۹)

طب جدید میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جسم کے لئے حصول حرارت کا یہ طریقہ صحیح نہیں کہ جسم سے برودت کو زائل کر دیا جائے۔ بلکہ غیر مضر اور مفید شکل یہ ہے کہ جسم میں موجودہ حرارت کو باقی رکھنے کی کوشش کی جائے۔ مزید حرارت پیدا کرنا اور پھر شراب ایسے زہر ہلاہل سے قطعاً غلط ہے، اور پھر اس فریب کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ شراب پینے کے ساتھ ہی جو کچھ عارضی آثار چہرہ وغیرہ پر ظاہر ہوتے ہیں۔ حماقت سے اس کو حرارت سمجھ لیا گیا ہے، جو شخص شراب استعمال کرے گا۔ فوری طور پر اس کا چہرہ سرخ ہو جائے گا۔ اور اس کے رنگ پر سرخی دوڑ جائے گی، کیونکہ شراب کی طبیعت یہ ہے کہ وہ جلد کے اندر عروق شعریہ میں اپنا عمل شروع کرتی ہے۔ کبھی وہ سکڑ جاتے ہیں اور پھر پھیلتے ہیں۔ نتیجہ ان کا یہ ہوتا ہے کہ یہ رگیں خون کا وہ حصہ جو کھینچتی تھیں اس تیزی کے ساتھ سکڑنے اور پھیلنے کی وجہ سے خون کو زیادہ کھینچنے لگتی ہیں۔ اس لئے پینے والا خون کے تیز دباؤ کے ظاہری آثار کو دیکھ کر سمجھتا ہے کہ یہ حرارت شراب کی پیدا کی ہوئی

ہے، حالانکہ یہ شعور غلط ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ کیفیت بہت عارضی ہوتی ہے۔ نشہ کے دور ہوتے ہی رنگ اپنی حالت پر آجاتا ہے اور پھر شراب کے استعمال کا ردعمل شروع ہوتا ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہوتا کہ شراب جسم میں حرارت پیدا کرتی ہے تو ان علاقوں میں جو بے حد بارد اور ٹھنڈے ہیں، شراب کی خاص یہ منفعت ظاہر ہونا چاہئے تھی، حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ مثلاً منطقہ منجمد شمالی اور جنوبی میں شراب کے استعمال کی وجہ سے جسم کی حرارت اور گھٹ جاتی ہے اور اس حرارت کے زائل اور فنا ہونے کی وجہ سے اکثر اموات واقع ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان دونوں منطقوں میں مزدور پیشہ انسان شراب قانوناً نہیں پی سکتے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ شراب جسم میں حرارت پیدا نہیں کر سکتی، بلکہ جو کچھ حرارت ہوتی بھی ہے اسے بھی زائل کر دیتی ہے۔

یہاں پر ایک بات اور بھی سمجھ لینا چاہئے، اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ شرابی کا چہرہ سرخ اور آنکھیں بھی سرخ ہوتی ہیں۔ ہماری اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ وہ بھی شراب ہی کا اثر ہوتا ہے۔ اور کیونکہ مسلسل استعمال کیا جاتا ہے تو اسکی وجہ سے یہ آثار بھی دیرپا ہو جاتے ہیں۔ ان کو یہ سمجھنا کہ شراب کی پیدا کردہ حرارت ہے قطعاً غلط ہوگا، اسی کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"واذا تعاطى الانسان الكحول زمانا طويلاً فان الاوعية الدموية الصغيرة المنتشرة على سطح الجلد بعد ان يتوالى عليها التمدد باستمرار تبقى فى هذه الحالة من التمدد والانبساط ولهذا احمر الوجه والانف وعينيه ملتهبتين۔"

(الخمر والحیوۃ ص ۶۲)

اور جسطرح یہ غلط ہے کہ شراب جسم کو حرارت پہنچاتی ہے، بلاشبہ یہ بھی بداہتہً خلاف واقعہ ہے کہ شراب سے رنگ صاف ہوتا ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ:

"شراب سے رنگ بھی صاف نہیں ہوتا، بلکہ خون کے دوران کو تیز کرنے کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لئے چہرہ پر سرخی آجاتی ہے اور سکر و نشہ کے زائل ہونے پر وہ سرخی سیاہی سے بدلنے لگتی ہے۔" (ایضاً)

مقالہ نگار کی اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ شراب نہ ہضم طعام کے لئے مفید اور نہ جسم میں حرارت پیدا کرنے کے لئے کارآمد بلکہ اس کے استعمال سے ہزارہا وہ خطرناک اور جانگسل بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جن کی ہلاکت کی تفصیل، اعداد و شمار کی روشنی میں پیش کی گئی ہے، ان اعداد و شمار اور ہماری تفصیلات کے بعد یہ کہنا کہ شراب میں طبی اعتبار سے کچھ منافع ہیں، حقیقت سے کس قدر گریز و انحراف ہوگا۔ اور یہ تو وہ مضرتیں

تھیں، جن کا تعلق جسمانی صحت سے تھا، شراب اخلاق پر بھی ایک بہت ناگوار اثر چھوڑتی ہے چنانچہ عموماً شرابی ایسے گندے اور مذموم اخلاق کے حامل ہوتے ہیں جو عام طور پر سوسائٹی میں بری نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور جن سے تمام ماحول ہمیشہ پریشان اور مکدر رہتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ ان اخلاقی بیماریوں کی بھی ایک مختصر سی تفصیل پیش کریں جو مے نوشی کے نتیجہ میں رونما ہوتی ہیں۔

چوری | شراب کو حاصل کرنے کے لئے مال و دولت کے تمام ذخیروں کو اس بہتے ہوئے پانی میں صرف کرنے کے بعد شرابی ایسے ذرائع سے بھی چند پیسے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے بہت ناپسندیدہ ہیں، چنانچہ عموماً شرابی چور ہو جاتے ہیں، اور بعض اوقات یہ چوری بہت سے جرائم کی پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں کراچی میں "دنیا کے بادشاہ" گرفتار ہوئے، اخبار نے اس خبر کی تفصیل دیتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> "پولیس نے کل رات صدر سے ایک نوجوان کو جو اپنے آپ کو دنیا کا بادشاہ بتاتا ہے، دوکان کا شیشہ توڑ کر دوائیاں چراتے ہوئے گرفتار کر لیا، بتایا جاتا ہے کہ جب پولیس نے اس نوجوان کو پکڑ کر اس کا نام پوچھا تو اس نے بادشاہوں کی طرح اکڑ کر مونچھیں اینٹھتے ہوئے ایک زور دار قہقہہ لگا کر کہا کہ میرا نام "دنیا کا بادشاہ" ہے۔ پولیس کے سپاہی نے کئی مرتبہ اس سے نام دریافت کیا۔ لیکن ہر بار اس نے یہی کہا، آخر اسے پولیس تھانے لے جایا گیا۔ لیکن وہاں بھی پولیس افسر اس کا نام معلوم نہ کر سکے، جوان کی حرکات و سکنات کچھ اس قسم کی تھیں کہ پولیس افسر گھبرا گئے اور اس کا معائنہ کرانے کے لئے ہسپتال بھیج دیا گیا، ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد بتایا کہ یہ نوجوان بہت زیادہ شراب پئے ہوئے ہے۔" "آزاد" ۳ر دسمبر ۱۹۵۶ء لاہور

شاید بعض لوگوں کو شبہ ہو کہ نشہ کی حالت میں ایسی حرکات غیر متوقع نہیں اس لئے ایسے چند واقعات سے شرابیوں پر "چوری" کا الزام کس حد تک صحیح ہوگا، لیکن ہم نے کہا ہے کہ شراب کو حاصل کرنے کے لئے ہر مناسب اور غیر مناسب اقدام کئے جا سکتے ہیں اور چوری سب سے زیادہ قریبی ذریعہ ہے ناجائز طور پر مال و دولت حاصل کرنے کا۔ "الخمر والحیوٰۃ" کے مصنف نے بھی لکھا ہے کہ:

> "وقد دلت الشواهد في كثير من الاحيان على ان خيانة العهود بدأت عند بعض السارقين حين اعوزهم المال لشراء الخمور التي الفوا تعاطيها ولم يطيقوا صبرا على تجنبها فتأصلت فيهم بذلك عادة السرقة حتى صار التلصص لبعض طباعهم وسجية فيهم." (ص۹۲)

مطلب وہی ہے کہ شراب کے عادی ہو جانے کے بعد ایسے جرائم کا ارتکاب غیر یقینی نہیں، بعض اوقات شرابی ایسی کم قیمت چیزوں کی بھی چوری کرنے سے گریز نہیں کرتے جو فی نفسہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں لیکن اپنے نشہ اور طلب میں سب کچھ کر گزرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ شرابیوں کی ایک بڑی تعداد جن سے جیل خانے ہمیشہ بھرے رہتے ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر چوریوں کے الزام میں ماخوذ ہوتے ہیں، یا پھر بڑے ذلیل طریقہ سے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کریں گے اور چند کوڑیوں کے لئے اپنی عزت و وقار کا پاس تک باقی نہ رکھا جائے گا۔ اس لئے شراب کے استعمال کے نتیجے میں

گداگری　گدائی اور بھیک کا اختیار کرنا بھی غیر متوقع نہیں، ذیل کا واقعہ ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرتا ہے۔ ہندوستان کے مشہور شاعر اختر شیرانی جن کا اس سے پہلے بھی ذکر گزرا انہیں کے متعلق سوانح نگار نے لکھا ہے کہ :

"شراب کے بارے میں وہ اپنے خاص دوستوں کی جیب کو اپنی جیب سمجھتے تھے اور حسن طلب ایسا لطیف اور شاعرانہ ہوتا تھا کہ بغیر فرمائش پوری کئے رہا نہیں جاتا تھا، ایک مرتبہ سرما کا مہینہ تھا۔ اور میں باہر دھوپ میں بیٹھا مطلب کر رہا تھا کہ دو بلانوش شاعر دوستوں کو ہمراہ لے کر آگئے۔

ایک صاحب نے فرمایا :　ع　دھوپ میں اپنے مریضوں کو دوا دیتے ہیں

دوسرے صاحب بولے :　ع　اور شاعر کوئی آئے تو پلا دیتے ہیں

اور اختر صاحب نے فرمایا :　ع　اہل دل ایسے مسیحا کو دعا دیتے ہیں

اس کے بعد ان شاعروں کے سامنے فرمائش شروع کی اور بوتل کے پیسے لے کر چلتے ہوئے۔"　(نقوش شخصیات نمبر ۲ صفحہ ۸۹۳)

اپنے نشہ کو پورا کرنے کے لئے یہ ذلیل گدائی اور بھیکاری بننا اسی ام الخبائث کا نتیجہ ہے۔ آہ کہ ایک علمی خانوادہ کا فرد حرام مشروبہ کے لئے سوال کا ہاتھ پھیلا رہا تھا، حالانکہ کہا گیا ہے کہ : "السوال ذل" یعنی سوال ذلت ہے، سڑکوں پر بیٹھنے والے تنومند شہروں میں ہٹے کٹے اصرار و الحاح کے ساتھ مانگنے والے بھکاریوں میں ایک بڑی تعداد ان مصنوعی فقیروں کی ہوتی ہے۔ جو مانگ مانگ کر سیدھے شراب کی بھٹیوں پر جاتے ہیں اور بھرتے کی بوتلیں پی کر انسانیت کو بھی ذلیل کرتے ہیں۔ اور اس طرح گداگری کا وہ دروازہ غیر ضروری طور پر کھولتے ہیں، جس کو مذموم و معیوب قرار دینے میں مذاہب عالم میں سب سے زیادہ اسلام ہی پیش پیش ہے، یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔؟ اور سوسائٹی کے مہذب افراد اس ذلیل پیشہ کو اختیار کرنے پر کیوں

مجبور ہوتے ہیں، صرف اسی ام الخبائث کی ناجائز طلب کو پورا کرنے کے لئے جس کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ گویا کہ ایک حرام فعل کے ارتکاب پر ایک دوسرے معیوب و مذموم حربہ سے مدد لی جاتی ہے۔ سوچنے والے اگر سوچ سکیں تو شراب کی اسلام میں حرمت کی وجہ خاص اس عنوان سے بھی بہت جلد سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن سکر و نشہ میں کھوئی ہوئی بصیرتیں اور عقل و دانش اب کہاں اس قابل کہ ان نقاط پہ سوچنے کی زحمت گوارا کرے۔ اسی طرح شرابی کذب بیانی وخیانت۔ دروغ بانی اور وعدہ خلافی کے ان امراض میں مبتلا پائے جاتے ہیں جو عالم انسانی اور اخلاقی زندگی میں سخت معیوب کردار ہے۔

کذب بیانی | شراب نوشی کے نتیجہ میں بعض اوقات اپنے جرائم کو چھپانے کے لئے اس ہتھیار سے بھی کام لیا جاتا ہے، جو اسلامی زندگی سے گذر کر عام اخلاقی زندگی میں بھی بہت معیوب ہے۔ چنانچہ شراب کے متوالوں کی یہ قبیح ترین عادت اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ ضرورتاً اور بلا ضرورت ہر وقت کذب بیانی، فحش گوئی، خیانت عہد کے مرتکب ہوتے ہیں۔ سید عبدالحمید عدم صاحب کے سوانح میں ہے کہ:

"انہیں دنوں عدم صاحب دو تین روز کے لئے اچانک غائب ہوگئے۔ مجھے تشویش ہوئی۔ آخر چوتھے روز آئے اور کہنے لگے کہ حضور ایک چھوٹا سا مقدمہ بن گیا ہے، میں حیران ہوا کہ آخر معاملہ کیا ہے، کہنے لگے کہ میں اسی لئے تین چار روز سے آیا نہیں، حضور بات یہ ہے کہ میرے پاس اس دن ایک بوتل رم کی اور چھ بوتلیں بیئر کی تھیں "بیانیر" سے کوئی تانگہ والا، لاہور آنے کے لئے تیار نہ تھا، سب کہتے تھے کہ کرفیو کا وقت ہونے والا ہے۔ آخر ایک تانگہ والے کو میں نے تیار کر لیا، بوتلیں ساتھ تھیں، راستے ہی میں کرفیو کا وقت ہوگیا، پولیس نے تانگہ والے کا چالان کر دیا، بوتلوں پر قبضہ کر لیا۔ اور مجھے کوتوالی لے گئے سپرنٹنڈنٹ پولیس کے استفسار پر میں نے بتایا کہ یہ شراب میں اپنے اور اپنے ایک دوست شاد امرتسری کے لئے لے جا رہا تھا۔ حضور آج تاریخ ہے اور آج آپ کو میرے ساتھ کوتوالی جانا ہوگا تاکہ معاملہ ختم ہو اور شراب واپس ملے ورنہ حضور شراب مفت میں حرام ہو جائے گی۔" (ص ۱۱۳۹ نقوش)

ایک معزز اردو شاعر کو کوتوالی میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہونا پڑا اور کذب بیانی و دروغ گوئی سے گلو خلاصی کے لئے کام لیا گیا، یہ صرف ام الخبائث کی کرشمہ کاریاں ہیں۔ (باقی آئندہ)

ایک مکتوب — شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی مدظلہٗ

لمحۂ فکریہ

کیا جہاد کو منسوخ سمجھنے والے جہاد کر سکتے ہیں۔؟

پاکستان کی بربادی میں قادیانیت کا حصّہ

منظم انداد کی ضرورت ہے

الحق بابت جنوری و فروری موصول ہوا سقوطِ مشرقی پاکستان پر مضامین دیکھے۔ مگر بڑا سبب اس سقوط کا بیان سے رہ گیا۔ بانوے یا پورا نوے ہزار فوج کا جو ایک لاکھ کے قریب تھی، ہتھیار ڈال دینا۔ تاریخِ اسلام میں اس سے پہلے نظر سے نہیں گذرا۔ یہ عذر غلط ہے کہ ناکہ بندی کی وجہ سے اسلحہ اور کمک پہنچانا دشوار تھا۔ ایک لاکھ کے قریب فوج کو کمک کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح اسلحہ بھی ہماری فوجوں نے دشمن سے چھین کر حاصل کیا ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ دشمن کا کثیر تعداد میں اسلحہ چھینا گیا۔ اور اس سے کام لیا گیا ـــــ میرے خیال میں بڑا سبب اس شکست کا یہ تھا کہ ہماری فوج میں اور جرنیلوں میں بعض قادیانی تھے۔ اور یحییٰ خان کے بعض مشیر بھی قادیانی تھے۔ ان لوگوں نے مشورہ دیا کہ ہتھیار ڈال دئے جائیں، اور جنگ موقوف کی جائے۔ اس فرقہ کو پاکستان سے ہمدردی نہیں بلکہ بھارت کے ساتھ زیادہ ہمدردی ہے۔ کیونکہ ان کا مرکز قادیان بھارت میں ہے۔ پھر یہ جماعت مرتد ہے۔ اس کو اسلام اور شوکتِ اسلام سے کیا واسطہ ـــ؟ ان کے نزدیک جہاد منسوخ ہے۔ تو یہ جذبۂ جہاد سے عاری ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ علماء اسلام اسی تحریک کو منظم طریقہ سے چلائیں کہ اس شکست کا بڑا سبب قادیانی جماعت کا پاکستان کے ہر شعبہ میں یہاں تک کہ فوج میں اور فوج کے بڑے عہدوں میں دخیل ہو جانا ہے۔ صدر کے مشیروں میں بھی بعض قادیانی موجود ہیں اور اب بھی ہیں۔[1] جب پاکستان بنا اور اسکی وزارت خارجہ کا عہدہ ظفر اللہ خان قادیانی کو دیا گیا۔ تو حضرت مولانا شبیر احمد صاحب نے نواب زادہ لیاقت علی خان کو لکھا تھا کہ قادیانیوں کو حکومت کے کلیدی عہدوں پر فائز کرنا ہرگز جائز نہیں اگر آج اس تلخ گھونٹ کو گلے سے اتار لیا گیا تو آئندہ زہر کا پیالہ پینے کو تیار رہنا چاہیئے۔ چنانچہ زہر کا ایک پیالہ تو پی لیا گیا۔ کہ مشرقی پاکستان ہاتھ سے نکل گیا۔ اگر اب بھی ان لوگوں کو حکومت میں اور فوج میں داخل کیا گیا۔ تو دوسرا زہر کا پیالہ پینے کو تیار رہنا چاہیئے کہ مغربی پاکستان بھی ہاتھ سے نکل جائیگا خدا نہ کرے۔ اس نظریہ کو مسلمانوں میں پھیلانے کی ضرورت ہے۔ میں تو لمبے سفر سے معذور ہوں۔ اس کے لئے ہوشیار کام کرنے والوں کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ جناب والا اس پر توجہ فرمائیں گے۔

والسلام۔

ظفر احمد عثمانی عفی عنہ

۲۳ محرم ۱۳۹۲ھ

[1] اور اب تو نظرِ بد دور ایک پوری کھیپ دفاعی کلیدی مناصب پر آ گئی ہے۔ "مدیر"

ابلاغ عامہ کے ذرائع

قومی تخریب کا نہیں

تعمیر کا ذریعہ ہونے چاہئیں

★

مولانا کوثر نیازی ایڈیٹر شہاب ...... بنام ...... مولانا کوثر نیازی وزیر اطلاعات

محترم دوست مولانا کوثر نیازی وزارتِ اطلاعات حج و اوقاف کے منصب جلیلہ پر فائز ہیں۔ ملک کی تعمیر نو اور معاشرہ کی تطہیر میں ہماری صحافت، پریس، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جو موثر کردار ادا کرسکتی ہیں بخوبی واضح ہے، پھر ناچ گانے والی ثقافت اور فلمی صنعت جس بے دردی سے ہماری اخلاقی قدروں کی بربادی کا ذریعہ بنتی جارہی ہے، مولانا جیسے زیرک اور حساس انسان اس سے بخوبی واقف ہیں۔ اب تک ابلاغِ عامہ کے ذرائع زیادہ تر تعمیر کا نہیں قومی تخریب کا ذریعہ بنے ہیں۔ محترم وزیر اطلاعات صاحب ایڈیٹر شہاب کی حیثیت سے اسلامی تہذیب و ثقافت سے متعلقہ امور پر بارہا قلم اٹھاتے رہے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے ابلاغ عامہ کے اہم ذرائع ان کی دسترس میں دیکر انہیں آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ ہم ان کی خدمت میں ان ہی کی لکھی ہوئی تحریرات پر کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ خدا کرے۔ وہ اس نازک مرحلہ میں سرخروئی سے ہمکنار ہوں۔ اور اس منصب کو معاشرہ کی اسلامی تشکیل و تعمیر کا ذریعہ بنا سکیں۔ (سمیع الحق)

★

۱۔ ہم نے اس سے قبل بھی کراچی کے اخبارات میں اس قسم کے اشتہارات کا نوٹس لیا تھا۔ اور یہ بات عرض کی تھی کہ اسلام میں تہوار، جہاں تفریح اور خوشباشی کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ وہاں ان کو عبادات کا درجہ بھی دے دیا گیا ہے۔ خاص طور پر عید ہمارا سب سے بڑا تہوار ہے۔ اور اس کی بڑائی یہ نہیں ہے۔ کہ ہم کھیل کھیلیں۔ بلکہ یہ رمضان المبارک میں عبادات کی توفیق پانے پر اظہار تشکر کا دن ہے۔ اس لئے اس کا آغاز ایک خاص نماز سے ہوتا ہے۔ اس طرح ہماری خوشیاں اور ہماری تفریح دین و اخلاق کی اقتدار کے

تحت ہو جاتی ہیں۔

ان اعلیٰ اقدار کو قائم اور برقرار رکھنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ہم کتنے بھی ماڈرن ہو جائیں۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے۔ کہ ہماری اپنی ایک ثقافت اور تہذیب ہے۔ مغربی تہذیب ہو۔ یا کوئی دوسری تہذیب اس کی غلامی اور اندھا دھند تقلید بہرحال ماڈرن ہونے کے مفہوم میں شامل نہیں ہو سکتی۔ ہمیں ذہنی اور تہذیبی غلامی سے اپنے آپ کو بہرحال محفوظ رکھنا چاہئے۔ اور کوشش کرنی چاہئے کہ ہم اپنے تہذیبی دائرول میں رہ کر اپنے عمل سے ان تہذیبی دائروں کا احساس دوسروں کو کرائیں۔ یہ آزاد قوموں کا ایک قابل فخر خاصہ ہوتا ہے۔ کہ وہ دوسروں کی نقل نہیں کرتیں۔ بلکہ دوسروں کو اپنی نقل کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مسلمانوں کو کم ازکم اپنی تہذیب اور اپنے دین پر اتنا فخر ضرور ہونا چاہئے۔ کہ وہ اپنے آپ کو غیر تہذیبوں کی غلامی کے سپرد اتنی آسانی سے نہ کر دیں۔ جس کا اظہار ان اشتہاروں میں ہوا ہے۔ (شہاب۔ ۵ر فروری ۱۹۶۷ء ص۹)

۲۔ کراچی کے انگریزی اخبارات میں ہوٹلوں میں ناچ رنگ کی محفلوں کے اشتہارات کراچی کی زندگی کا معمول ہے۔ کہا جاتا ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے اس سب سے بڑے تجارتی مرکز، بین الاقوامی ہوائی مستقر کی آبادی میں کچھ عناصر ایسے بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ جن کے لئے سکر فروشی سے لے کر لذت فروشی تک کا اہتمام اس شہر کو کرنا پڑتا ہے۔ ہم ذاتی طور پر اس سمجھوتے کے قائل نہیں۔ اور اسے اس جرم کے زیر عنوان رکھتے ہیں۔ جسے "اشفاف جرم" کہا جاتا ہے۔ ہم سکر فروشی اور لذت فروشی کو کسی بھی عنوان سے کسی شہر میں جائز نہیں سمجھتے اور ہمارا یہ عقیدہ ہے۔ کہ پاکستان کے معاشرے میں اگر اس قسم کی تجارت کو وسعت سے دخیل ہونے کا موقع دیا گیا۔ تو پاکستان کی بنیادیں اس حد تک مضبوط نہیں رہ سکیں گی۔ جس حد تک انہیں مضبوط رہنا چاہئے...... اس لئے ہم صرف مذہبی، اعتقادی یا جذباتی نقطۂ نظر ہی سے نہیں۔ بلکہ ٹھوس اور ٹھیٹھ قومی اور ملکی نقطۂ نظر سے بھی اس قسم کی مکروہات سے حتی المقدور قولاً اور عملاً اجتناب، کو ضروری سمجھتے ہیں۔ کراچی کے اخبارات میں ان مکروہات کی نمائش کے خلاف ہم اعلانیہ نفرت کا اظہار کرتے اور اس قسم کی "فیشن ایبل" اور "جدید" تفریحوں اور مصروفیات کو پاکستان کی قوم اور اس ملک کی ملت کے لئے زہر ہلاہل سمجھتے ہیں۔ ہمارا پختہ عقیدہ ہے کہ کوئی مصلحت، کوئی جواز، کوئی وجہ زہر ہلاہل کو تریاق نہیں بنا سکتی۔ اس زہر کے اثرات وہی ہوں گے جو تاریخ میں مثلاً روم میں ظاہر ہوئے۔ بازنطینی حشمت وجلال پر مترتب ہوئے۔ اور جو اب انگلستان اور امریکہ کے معاشرے میں بھی کچھ ایسے خفیہ نہیں ہیں۔ وہاں کی دیکھ سکنے والی نگاہیں ان اثرات کو مستقبل کے لئے مفید نہیں سمجھ

سکتیں۔ اور ان کے خلاف احتجاج کرنے والوں کی ہرگز کوئی کمی نہیں ہے۔

اس صورت حال میں ہمارے اس ذہنی کرب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جو لاہور سے چھپنے والے انگریزی اخبار میں اسی قبیل کے اشتہارات دیکھ کر ہوا۔ ایک نئے ہوٹل کے قیام کے بعد شاید لاہور کے پرانے فیشن ایبل ہوٹلوں نے اپنی تجارت کو متاثر محسوس کیا ہے۔ اور اسے "نئی زندگی" دینے کے لئے "رات دیر تک کھلے" رہنے ۔۔۔ سپین اور اطالیہ کی "پریوں" کے ناچ اور دلچسپی کے دیگر خطوط و نکات کیطرف اپنے سرپرستوں کو متوجہ کرنے کے لئے اشتہارات دینے شروع کر دئیے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں فواحش اور مکروہات کراچی سے لاہور تک وہ سفر پورا کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جن کو لاہور نے مدتوں سے روکے رکھا تھا۔ (شہاب ۔ ۲۲ ر اکتوبر ۱۹۶۷ء صـ۳)

۳۔ جواب کا دوسرا حصہ اس سے کہیں زیادہ سائنٹیفک اور ماڈرن تھا۔ کہا گیا۔ کہ پاکستان کی سرے سے کوئی ثقافت نہیں۔ پاکستان مختلف علاقوں کا مجموعہ ہے۔ جو اپنی ذات میں الگ الگ وحدتیں ہیں۔ ہر وحدت کی اپنی ثقافت ہے جو اپنے اپنے لوک گیتوں، لوک ناچوں، اور لوک کہانیوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ مختلف علاقوں کے یہی ٹھکے ٹھوڑے ٹھمریاں پاکستان کی ثقافت ہیں۔ انہی کو ابھارنا پاکستان کی ثقافت کا اظہار کرنا ہے۔ چنانچہ جب غیر ملکی مندوبین تشریف لاتے تو ان کیساتھ بڑا لطیفہ ہوتا۔ وہ سابق صوبہ سرحد میں جاتے، تو خٹک ناچ دیکھتے۔ سابق پنجاب میں آتے تو بھنگڑا ملاحظہ کرتے، سندھ میں جاتے تو کافیاں سنتے، بلوچستان میں تشریف لے جاتے تو ان کی تواضع الغوزے سے کی جاتی۔ اس سے ان کے ذہن کو یہ تاثر دیا جاتا۔ کہ کم از کم مغربی پاکستان ایک وحدت نہیں ہے۔ یہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا کچومر ہے، جس کو ایک بنانے والا "ذہن" یورپ سے آتا ہے۔ یہ ڈرامہ ہو، رمبا ناچ ہو یا ٹوسٹ۔ بہرحال مغربی پاکستان کو ایک بنانے والی طاقت مغربی طاقت ہی ہے۔ ہمارے اپنے پاس کچھ نہیں۔

جواب کا یہ سائنٹیفک حصہ دراصل اسی تصور کی ایک شاخ تھا۔ جو پاکستانی ثقافت کو پانچ ہزار سال کی قدامتوں میں دھکیل کر موہنجوداڑو جیسے قصبات میں محدود کرنا چاہتا تھا۔ اس تصور میں ترمیم صرف اتنی ہوتی تھی، یہ قصبے پھیل کر صوبہ بن گئے۔ اگویا صدیوں کے اثرات کو کسی حد تک قبول تو کر لیا گیا۔ لیکن بہرحال علاقائی وحدت کا جواز باقی رہا۔ واضح رہے کہ یہ سیاسی بات نہ تھی۔ خالص ثقافتی بات تھی۔ اور کیونکہ سیاست، ثقافت سے علیحدہ نہیں رکھی جا سکتی۔ اس لئے اگر اس کے بین السطور وہ تھوڑی بہت

سیاست میں ہو جائے تو مضائقہ نہیں۔ (شہاب ۱۲ر فروری ۱۹۶۷ء صفحہ ۵)

۴۔ صدر مملکت پاکستان پورے عالم اسلام کے شکریئے کے مستحق ہیں۔ کہ انہوں نے اہم مسئلے کی طرف قوم کو متوجہ کیا۔ اور پاکستان پورے عالم اسلام کے شکریئے کا مستحق ہوگا۔ اگر اس کے ادیب ایسا ادب پیدا کرنے لگیں جو قوم کے اذہان کو رومان پسندی سے نکال کر حقیقت پسندی اور حقیقت بینی کی منزلوں پر لے آئے۔ (شہاب ۲ر اپریل ۱۹۶۷ء صفحہ ۴)

۵۔ صوبائی وزیر قانون و پارلیمانی امور مسٹر اے۔ بی اخوند نے کراچی میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے یہ اطمینان بخش اعلان کیا ہے۔ کہ صوبائی حکومت تعلیمی اداروں میں ناچ گانے کی محفلوں پر پابندی کے حکم کو واپس نہیں لے گی۔ یہ پابندی بدستور جاری رہے گی۔

گزشتہ سال جب صوبائی حکومت نے تعلیمی اداروں میں ناچ گانے کی محفلوں پر پابندی عائد کرکے ایک عوامی مطالبے کو پذیرائی بخشی تھی۔ تو صوبے کی غالب اکثریت کیطرف سے حکومت کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا گیا تھا۔ یہ درست ہے کہ ارباب نشاط اور ان کے حامیوں کی ایک خوردبینی اقلیت نے اس فیصلے کے خلاف ناک بھوں چڑھائی۔ اور ان حلقوں نے اپنے طور پر اس کے خلاف احتجاج بھی کیا لیکن یہ واقعہ اپنی جگہ پر کسی تفصیل کا محتاج نہیں۔ کہ حکومت کے حلقوں میں اسی اظہار ناراضگی کو مغربی پاکستان کی رائے عامہ نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے یہ قابل اعتناء قرار نہیں پایا۔ گذشتہ دنوں یہ خبر سننے میں آئی۔ کہ مرکزی حکومت نے۔ اس حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ اور سکول اور کالج ایک دفعہ پھر ان بے ہودہ دھما چوکڑیوں کے مرکز قرار پائیں گے۔ جن کو کسی بھی شریف حلقے میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس نئی کروٹ کے خلاف عوامی حلقوں میں شدید ردِ عمل ہوا۔ اور اس کی تنسیخ کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ بات نہایت درجہ اطمینان بخش ہے۔ کہ صوبائی حکومت نے اپنی پوزیشن کی وضاحت کر دی ہے، ہمیں یقین ہے کہ اس کو "سیاسی مسئلہ" بنانے والے حلقوں کیطرف سے بھی اس اعلان کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ (شہاب۔ ۲۹ر جنوری ۱۹۶۷ء صفحہ ۱۲)

۶۔ اس لئے ہم ان تمام "دانشورانہ" خیالات کو مضحکہ خیز ہونے کی حد تک مہمل سمجھتے ہیں۔ اور ہم نے اس سے پہلے ایک سے زائد مرتبہ اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ہمارے یہاں اکا دکا دانشور ایسے بھی سامنے آنے لگے ہیں۔ جو مغرب زدگی کی ان حدوں تک نہیں پہنچے کہ اپنی ہر چیز میں انہیں جہالت اور بربریت کی بو آنے لگی ہو۔ ہم سب سے زیادہ اپنے عظیم اور بلند مرتبہ دانشور مسٹر جسٹس ایس۔ آر کارنیلئس کے شکر گذار ہیں۔ جنہوں نے مسلمان دانشوروں سے پہلے عالمی سطح پر اس بات کا اعلان کیا کہ اسلامی قوانین تعزیر صرف قابل عمل ہی نہیں، بہتر نتائج کے حامل بھی ہو سکتے ہیں۔ اور ان کو اختیار کر کے جرائم کی حتمی بیخ کنی ممکن ہے۔ (شہاب ۱۲ر فروری ۱۹۶۷ء صفحہ ۳)

آئین ساز قومی اسمبلی کی توجہ کے لئے

مولانا محمد اشرف صدر شعبہ عربی اسلامیہ کالج پشاور

پاکستان کی تعمیرِ نو میں اسلام کی اہمیت

یہ مقالہ پاکستان اکیڈمی برائے دیہی ترقی پشاور کے علما پراجیکٹ کے منعقدہ کردہ علماء کنونشن (۲۹ فروری ۱۹۷۲ء) میں پڑھا گیا

۱۴ اپریل ۷۲ء کو قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہے۔ اس سرزمین بے آئین کے باشندوں کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ قومی و ملی بقاء و حیات کی کتنی امیدیں اس سے وابستہ ہیں۔۔۔؟ اس سے ارکان اسمبلی بخوبی آگاہ ہوں گے۔ ہم معزز ارکان کے حق میں نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہوئے پیش نظر مضمون میں نئی آئین سازی کے موقع پر انکی توجہات ایک نہایت اہم مسئلہ کیطرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔۔۔ تشکیل پاکستان کے وقت اسلامیانِ ہند سے جو وعدے کئے گئے تھے اہم آئین سازی کے موقع پر معزز ارکان کو اس مضمون میں اسکی کچھ جھلکیاں بھی دکھانا چاہتے ہیں۔

(سمیع الحق)

★

پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے جسکی بنیاد اسلام کے اس جامع اور عالمگیر نظریہ پر رکھی گئی ہے۔ کہ دینِ اسلام ہی انسانوں کے دینی و دنیاوی تمام مسائل کا حل اور ضرورتوں کا کفیل ہے۔ بانیانِ پاکستان قائداعظم مرحوم، لیاقت علی خان مرحوم اور دیگر زعماء لیگ، پاکستان کی جدوجہد میں اسی نظریہ کو لے کر آگے بڑھے

تھے اور اس کی بنیاد پر اسلامیان ہند و پاک نے اپنی امنگیں اور امیدیں اس خطۂ زمین کے ساتھ وابستہ کر دی تھیں جس کا نام پاکستان تھا۔ اور جس میں بقول لیاقت علی خان مرحوم اسلامی نظریۂ حیات کو عملی طور پر رائج کرنا اور اسے اسلامی نظام حیات کا تجربہ گاہ بنانا تھا۔ قائد اعظمؒ نے اپنے کئی بیانوں میں اس بات کو واضح فرما دیا تھا، کہ قرآن ہی مسلمانوں کا واحد ضابطۂ حیات ہے، جس میں اسکی آئینی، قانونی، مجلسی، معاشی، معاشرتی، غرض زندگی کے ہر ایک پہلو کا کامیاب حل موجود ہے۔ یاد دہانی کے طور پر چند اقتباسات پیش کرتا ہوں۔

قائد اعظمؒ نے نومبر ۱۹۳۹ء عید الفطر کے موقع پر بمبئی سے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"مسلمانو! ہمارا پروگرام قرآن پاک میں موجود ہے۔ ہم مسلمانوں کو لازم ہے، کہ قرآن پاک کو غور سے پڑھیں اور قرآنی پروگرام کے ہوتے ہوئے مسلم لیگ مسلمانوں کے سامنے کوئی دوسرا پروگرام پیش نہیں کر سکتی۔"

گاندھی کو اگست ۱۹۴۴ء میں لکھتے ہیں:

"قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں مذہبی اور مجلسی و دیوانی اور فوجداری، عسکری اور تعزیری، معاشی اور معاشرتی، غرضیکہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لیکر روزانہ امورِ حیات تک، روح کی نجات سے لیکر جسم کی صحت تک جماعت کے حقوق سے لیکر فرد کے حقوق و فرائض تک۔ اخلاق سے لیکر انسدادِ جرائم تک۔ زندگی میں جزا اور سزا سے لیکر عقبیٰ کی جزا و سزا تک ہر ایک فعل، قول اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔ لہٰذا جب میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمان ایک قوم ہے تو حیات و مابعد حیات کے ہر معیار اور ہر مقدار کے مطابق کہتا ہوں۔"

ستمبر ۱۹۴۵ء کے پیغام عید میں فرمایا:

"ہر مسلمان جانتا ہے کہ قرآنی تعلیمات محض عبادت اور اخلاقیات تک ہی محدود نہیں بلکہ قرآن کریم سب مسلمانوں کا دین و ایمان اور قانونِ حیات ہے۔ یعنی مذہبی اور معاشرتی تمدنی، تجارتی، عسکری، عدالتی اور تعزیری احکام کا مجموعہ ہے۔"

۱۹۴۲ء میں علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران فرمایا:

"رہنمائی کے لئے ہمارے پاس اسلام کی عظیم الشان شریعت موجود ہے۔۔۔۔۔۔ اسلام ہر شخص سے امید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض بجا لائے۔"

آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر ۱۹۴۳ء کی صدارتی تقریر میں واضح الفاظ میں اعلان فرمایا:

"مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ پاکستان کا طرزِ حکومت کیا ہوگا۔ پاکستان کا طرزِ حکومت تعین کرنے والا میں کون! یہ کام پاکستان کے رہنے والوں کا ہے، اور میرے خیال میں مسلمانوں کا طرزِ حکومت آج سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن حکیم نے فیصلہ کر دیا ہے۔"

تقسیم سے پیشتر لیاقت علی خان مرحوم نے جلسہ تقسیم اسناد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ہمارے سامنے ایک نہایت اہم سوال درپیش ہے اور وہ یہ کہ تم کس نظام کے تحت زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ ہماری طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہم اپنی آئندہ زندگی اسلامی طور و طریق اور آئین و قوانین کے بموجب بسر کرنا چاہتے ہیں، اور اس مقصد کے حصول کے لئے ہم کو ایک آزاد اور خود مختار سلطنت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ نظامِ زندگی کیا ہے۔ اور کن اصولوں پر اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی جائے گی۔ اس سوال کا جواب مسلمان کے پاس سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے۔ کہ مسلمان کے پیش نظر اس مقصدِ حیات کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے آج سے تیرہ سو برس قبل دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو پیغام الٰہی لیکر تشریف لائے تھے۔ اب وہ ہمارے پاس ہے۔ اور وہ دنیا کی عظیم المرتبت کتاب قرآن شریف میں اب بھی بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے موجود ہے۔ ہر مسلمان کا دین و ایمان ہے کہ اس کی موت و حیات سب اللہ ہی کے لئے وقف ہے۔ اللہ ہی ہمارا بادشاہ ہے۔ اور وہ ہی ہمارا حکمران ہے۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ جو کوئی بھی حکومت کرتا ہے وہ اللہ ہی کی طرف سے حکومت کرتا ہے۔ کیونکہ تمام حاکمیت اور طاقت اللہ ہی کو زیبا ہے۔ اسلامی نظامِ زندگی انسان کا ساختہ پرداختہ نہیں ہے۔ بلکہ واقعی طور پر وہ اس دنیا میں عمل پذیر رہ چکا ہے۔ اور اب بھی ہمارے پاس موجود ہے۔"

ان زعماء ملت کے یہ واضح اعلانات حقیقتاً اس سچائی پر مبنی تھے کہ امت محمدیہ مرحومہ کا اپنا ایک خاص مزاج ہے۔ اور یہ لافانی اور بے مثال امت اپنے قوام و تشکیلِ ملی میں صرف اس اندرونی یقین و اعتقاد و جذبۂ وحدت کی محتاج ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ امت محمدیہ کا مزاج سراسر دین پر قائم ہے۔ اگر اس کے دینی مزاج کی رعایت نہیں کی جائے گی تو یہ ملت من حیث الامت ختم ہو جائے گی۔ دوسری قومیں رنگ و نسل و وطن و زبان کی بنیادوں پر تشکیل پاتی ہیں۔ لیکن اسلام ان میں سے کسی بنیاد کو اصل قرار نہیں دیتا۔ وہ ان سب کی تخریب کے لیے

اس مابعد الطبیعاتی جذبۂ ملی پر "امت" کی تشکیل کرتا ہے، جسے "دین" کہتے ہیں۔ اسلام وہ قوی رشتہ ہے۔ جو مختلف قوموں، رنگوں اور نسلوں کے ایک لڑی میں پرو دیتا ہے۔ صہیب رومی ہوں یا بلال حبشی، سلمان فارسی ہوں یا ابوبکر قرشی سب ایک ہی ملت واحدہ کے محترم افراد ہیں۔ ان کی "اسلامیت" نے رنگ و نسل کے تمام بندھنوں کو توڑ دیا۔ پولیٹکل سائنٹسٹ موسیو رینان فرانسادی نے کہا ہے:

"کہ قومیت وہ جذبۂ اشتراک ہے جو مختلف افراد کو ایک لڑی میں پرو کر انہیں مقاصد حیات کی یکجہتی عطا کرتا ہے"

اسلام مسلمانوں میں عشق الٰہی و محبت رسول کا والہانہ جذبہ پیدا کر کے اس داعیۂ اشتراک کو جنم دیتا ہے۔ جو عقائد و مقاصد کی یکجہتی میں مختلف ملکوں اور مختلف نسلوں اور مختلف رنگوں مختلف طبقات کے انسانوں کو اکٹھا کر دیتا ہے۔ یہ رشتہ روحانی نسلی رشتہ سے برتر و قوی ہے۔ چنانچہ مفسرین امام رازی و امام بغوی وغیرہ نے شواہد سے اس حقیقت کو واضح و مبرھن کیا ہے۔ بقول جامیؒ ؎

بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی ۔۔۔ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

اسلامی جذبۂ ملی کے ایک سرشار سلمان فارسی نے "اسلامی قومیت" کی بنیاد کو ان الفاظ میں بیان فرمایا:

ابی الاسلام لا اب سواہ ۔۔۔ اذا افتخروا بقیس و تمیم

"میرے باپ کا نام اسلام ہے، اسلام کے سوا میرا کوئی باپ نہیں۔ لوگ قیس و تمیم کے قبیلوں پر فخر کرتے ہیں۔ اور میں "مسلم" ہونے پر فخر کرتا ہوں"

اسلام ملت مسلمہ کا اجتماعی نفس ناطقہ ہے۔ اگر اسلام اپنی حقیقت کے ساتھ ملت کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہوگا۔ تو یہ امت پھلتی پھولتی رہے گی۔ اور جس قدر یہ جذبہ کم ہوتا چلا جائے گا۔ اس پر اضمحلال و زوال کے آثار طاری ہوتے جائیں گے۔ حکیم شاعر اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے ؎

جب سرزمین ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصر عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

غرض امت محمدیہ اپنے قوام و مزاج میں جملہ امم و ملل انسانیہ سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ دین و مذہب کے بغیر اس کا ملی تشخص قطعاً ختم ہو جاتا ہے۔ اقبالؒ نے سچ کہا ہے ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر ۔۔۔ خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
انکی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار ۔۔۔ قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں ۔۔۔ اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

بہرحال اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد مذہب یعنی اسلام کی اہمیت پاکستان کی تعمیر نو میں ظاہر و باہر ہو جاتی ہے۔ ہر وہ نظام زندگی یا طریقہ کار جو اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق نہیں ہوگا۔ پاکستانی ملت کو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکے گا۔ اس کی دو بڑی وجوہ ہیں۔

۱۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ اور اس کا وجود اسلامی نظریۂ حیات کا مرہون منت ہے۔ جیسے تحریک پاکستان کا ہر واقف کار جانتا ہے۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ کوئی نظریاتی مملکت اپنے بنیادی نظریہ کو نظر انداز کر کے اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتی۔ جیسے کوئی سوشلسٹ مملکت سوشلزم کے نظریہ کو پس پشت ڈال کر اپنی نظریاتی حقیقت کو گم کر دیتی ہے۔ اسی طرح مملکت پاکستان اگر اپنے آپ کو اسلامی نظریۂ حیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کر پاتی، تو وہ نہ صرف اپنے نظریاتی وجود کو کھو دے گی، بلکہ اس کا اپنا وجود و تشخص اور "نام" بھی (خاکم بدہن) مٹ کر رہ جائے گا۔ وہ ممالک اور قومیں جو وطنیت رنگ اور نسل پر قائم ہیں۔ وہ اگر کسی نظریہ کو قبول یا ترک کر دیں تو ان کی وطنی، لونی اور نسلی انفرادیت باقی رہ سکتی ہے۔ لیکن اگر پاکستان اسلامی نظریۂ حیات سے دست کش ہو جائے تو اس کے ہاتھ سے وہ رشتہ ہی نکل جائے گا۔ جس نے باشندگان پاکستان کو "پاکستانی" بنایا ہے۔ اور بنگالی، بلوچی، پٹھان، سندھی، پنجابی اور مہاجر کو ایک امت کا فرد بنایا ہے۔ غرض پاکستانی قومیت و وطنیت بلکہ اس کا نام تک اسلامی نظریۂ حیات سے باقی و قائم ہے۔ اس لئے پاکستان کی تعمیر نو کا تصور بھی مذہب کو نظر انداز کر کے نہیں کیا جا سکتا۔ ہر وہ قدم جو پاکستان میں اسلام کے خلاف اٹھے گا۔ ملک کو مشکلات سے دوچار کر دے گا۔

۲۔ ہر قوم کا خاص مزاج ہوتا ہے۔ جس کی بنیاد وہ بنیادی عقائد و نظریات، رسوم و رواج ہوتے ہیں۔ جس میں وہ قوم دوسروں سے ممتاز ہوتی۔ امت محمدیہ اپنے مزاج کے لحاظ سے بہرحال "مذہبی" واقع ہوئی ہے، جو اسلام کے خلاف کسی چیز کو گوارا نہیں کر سکتی۔ اور اس کا اجتماعی مزاج کسی ایسی چیز کو ہضم نہیں کر سکتا۔ جو اسلام کے مخالف ہو۔

ملت پاکستانیہ کا ملی شعور دائمی طور پر کبھی ایسی بات کو قبول نہیں کر سکتا، جو مذہب کے خلاف ہو۔ اس وجہ سے قوم کے مذہبی مزاج کو نظر انداز کر کے کوئی قدم ملت کو تعمیر کی راہ پر نہیں ڈال سکتا۔

ان دو اہم بنیادوں کے بیان کے بعد چند حقائق کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

حضرات! اسلام نرا نظریہ ہی نہیں، بلکہ بقول قائد اعظم "ایک مکمل اور عملی ضابطۂ حیات ہے"

دوسرے مذاہب عملی زندگی میں اگر شکست کھا سکتے ہیں۔ لیکن اسلام کا آئین و قانون۔ نظامِ حیات و دستورِ مملکت چودہ سو سال تک عملی کسوٹی پر کسا جا چکا ہے۔ اس میں ہر زمانہ کے چیلنج کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسلام کا خدائی و عادلانہ نظامِ حیات دکھی انسانیت کے لئے واحد پیامِ نجات ہے۔ پاکستان کے مسائل کا حل بھی صرف اسلام ہے۔ جس کے بغیر ہمارا ہر مسئلہ مزید الجھتا جائے گا۔ آج پاکستان کی "وحدت کا راز" مختلف لسانی و علاقائی وحدتوں کو ایک "ملت" کی حیثیت سے مضبوط کرنے میں ہے۔ یہ بات واشگاف لفظوں میں کہی جا سکتی ہے کہ تعمیرِ نو میں اگر اسلام کے "جذبۂ ملی" کو زندہ و باقی رکھنے کی کوشش نہ کی گئی اور "مذہبی وحدت و حمیت" کی آبیاری نہ کی گئی تو خدانخواستہ اس پھول کی مختلف پتیاں بکھر کر رہ جائیں گی، جس کا سب سے بڑا ثبوت سقوطِ مشرقی پاکستان کا دردناک سانحہ ہے۔ اگر ہم نے اپنے دینی مزاج اور مذہبی یکجہتی کو پروان چڑھایا ہوتا۔ تو آج یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ پاکستان کے مختلف خطوں اور لسانی و ثقافتی وحدتوں کے جوڑنے کا واحد ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس نمایاں حقیقت کے بعد تعمیرِ نو میں مذہب کی اہمیت بلکہ سبقت و فوقیت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے۔

پاکستان میں معاشی ناہمواریوں نے معاشرہ میں زلزلہ آگیا ہے۔ اور معاشی بے چینی اور طبقاتی منافرت کا ایسا طوفان برپا ہے جس سے ملک کی چولیں تک ہل گئی ہیں۔ ہمیں یہ بات برملا کہنے میں کوئی باک نہیں۔ کہ پاکستانی بلکہ انسانی معاشی مسائل کا حل صرف اسلام کی لافانی تعلیمات میں ہے۔ اسلام کا نظامِ معاش سرمایہ داری کی قارونیت اور مزدکیت واشتراکیت واشتمالیت کی طبقاتی چپقلش کو بیک وقت ختم کر دیتا ہے۔ اسلام نے معاشی ناہمواریوں کا علاج جس عدل و انصاف سے کیا ہے۔ انسانی خود ساختہ نظام اس کا پرِ کاہ بھی نہیں کر سکتے۔ اسلام ایک طرف نجی ملکیت اور انفرادی عمل پیدائش کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ دوسری طرف تقسیمِ دولت کی ان راہوں کو وجود بخشتا ہے۔ جن سے دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہیں رہتی۔ بلکہ ہر شخص کی ضروریاتِ اربعہ (مکان، خوراک، پوشاک اور تعلیم) کی کفالت کے ساتھ باہمی ہمدردی اور مواسات بھوک و افلاس کو معاشرہ سے ختم کر دیتی ہے۔ تفصیل کا یہ مقام نہیں ورنہ بتایا جاتا کہ ناجائز پیداوار دولت کے ذرائع سود قمار احتکار حرام آمدنیوں، جن کی کوکھ سے منحوس سرمایہ داری نے جنم لیا ہے۔ اسلام نے کس طرح حرام قرار دیا ہے۔ اور آمدنی کے وہ ذرائع جو دولت کو چند افراد کے ہاتھ میں پہنچا دیتے ہیں۔ انہیں کیسے ختم کیا ہے، جو دولت کسی کے پاس جمع ہے اسے معاشرہ میں منتقل کرنے کے لئے زکوٰۃ و عشر، خمس و

صدقات ۔ میراث کے لازمی احکام صادر فرمائے ۔ مزید برآں خیرات صلہ رحمی ، غریبوں کی غمگساری و مدد وغیرہ کی مستقل خیراتی مدین قائم کیں ۔ امیروں کے مال میں ناداروں کا "حصہ وحق" شرعی حدود کے اندر مقرر کیا ۔

ناداروں کے مفاد کو مالداروں کا دینی قرار دیا ۔ اور مالداروں کے حقوق کا پورا کرنا ناداروں کی دینی ذمہ داری قرار دی گئی ۔ اسلامی معاشی نظریہ کی جان ہر طبقہ کی ضروریات کی کفالت کے ساتھ باہمی ہمدردی و مواسات ۔ مواخاۃ ومحبت ہے ۔ اسلامی معاشی نظریہ انسانوں میں طبقاتی تفریق و منافرت نہیں پیدا کرتا ، بلکہ ہر طبقہ کو اپنے دائرہ عمل میں افزائش دولت کے اسباب مہیا کرنے کے ساتھ ایسی باہمی ہم آہنگی اور جوڑ پیدا کرتا ہے ، جہاں حسد و رقابت کی بجائے محبت و تعاون کی فضا قائم ہوتی ہے ۔ اسلام میں گو مساوات مالی نہیں ، لیکن مساوات رتبی اور مساوات قانونی موجود ہے ۔ مجلس رتبہ میں مال وجائداد کی اضافی قدروں کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ اخلاق و اعمال کی بلندی ۔ "سرفرازی" کا واحد معیار ہے ۔ اسلام میں ملک ومال ۔ جائداد وجاہ معیار فضیلت نہیں ۔ بلکہ علم و تقویٰ اور اخلاق و اعمال ہیں ۔ ایک غیور و دیندار صاحب صلاح و تقویٰ مزدور ایک کروڑپتی بداعمال سیٹھ سے اسلام کی نگاہ میں اونچا ہے ۔ اسی طرح قانون کی نگاہ میں آقا و غلام شاہ و گدا سب برابر ہیں ۔

اسلام کا معاشی نظام اگر دیانتداری سے نافذ کر دیا جائے تو ایک ایسا ہموار معاشرہ پیدا ہو جائے گا ۔ جہاں تمام طبقات باہمی محبت و سلوک حقوق کی ادائیگی ۔ خدمت اور موانست کی زندگی گزار سکیں گے ۔ جہاں آقا و غلام کی تمیز نہیں ہوگی ۔ اور جہاں ہر شخص خوشحالی فارغ البالی اور فراوانی کی زندگی گزار رہا ہوگا ۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اسلام کی وسیع سلطنت میں کوئی زکوٰۃ قبول کرنے کے لائق محتاج نہیں رہا تھا ۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی سلطنت جو موجود مغربی پاکستان کی مشرقی سرحدوں سے لے کر اطلانٹک تک اور دیوار چین سے لے کر وسط افریقہ اور اندلس تک پھیلی ہوئی تھی ۔ کوئی نادار ایسا نہ ملتا تھا جسے زکوٰۃ و خیرات دی جاسکے ۔ یہ اسلامی معاشی نظام کی برکت تھی ۔ کہ جب تک مسلمانوں میں اسلامی اقدار کا پاس رہا ۔ طبقاتی منافرت اور مالی حرص و آز کا جہنم وجود میں نہ آسکا ۔ اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ہمارے معاشی مسائل کا حل نہ سرمایہ داری میں ہے نہ اشتراکیت میں ، ہم اپنی معاشی تعمیر تو صرف مذہب کے بتائے ہوئے خالص الٰہی اصولوں اور احکام کے مطابق کر سکتے ہیں ورنہ ہر قدم مزید الجھنوں کا سبب بنتا جائے گا ۔ اس سلسلے میں ہمیں بابائے ملت ، قائد اعظم کے وہ الفاظ یاد رکھنے چاہئیں جو انہوں نے سٹیٹ بنک آف پاکستان کی بنیاد رکھتے

ہوئے یکم جولائی ۱۹۴۸ء میں اپنی آخری پبلک تقریر میں فرمائے تھے:

"مغرب کے اقتصادی اصول ہمارے لئے عبرت آموز ہیں، جن کی وجہ سے آج دنیا بحران کا شکار ہے۔ آپ کے تحقیقی ادارے کو چاہیئے کہ وہ اسلامی نظریات پر سماجی اور اقتصادی زندگی کی بنیاد رکھے۔ ایک خوشحال اور مطمئن معاشرے کے لئے مغربی اصول کسی طرح مفید نہیں ہو سکتے۔ ہمیں تو ایک نئے طریق کار کو اپنانا چاہیئے۔ جو انسانی مساوات اور سماجی انصاف کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔"

ملک میں جرائم کا جو رجحان اور لاقانونیت کا جو میلان پیدا ہو رہا ہے۔ اس کا علاج مذہبی قوانین اور اسلامی شریعت کا نفاذ و اجراء ہے۔ اسلامی قانون و شریعت کے منافع اور اسلامی نظریہ عدل پر اس مختصر وقت میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم یہ بات بے محابا عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ انسانی خود ساختہ قوانین کبھی عادلانہ نہیں ہو سکتے۔ نہ انصاف کے تقاضوں کو کما حقہٗ پورا کر سکتے ہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ہر شخص اور ہر انسانی جمعیت و طبقہ کے مخصوص رجحانات، و میلانات، تقاضے و مفادات ہوتے ہیں۔ جن سے وہ انسان ہونے کی حیثیت سے کلیۃً کبھی مبرا نہیں ہو سکتا۔ قانون ساز اداروں اور مجالس مقننہ کی روزانہ کی کارروائیاں انسان کی اس بارے میں کوتاہ رسی پر شاہد عدل ہیں۔ ایک ملک کی قومی اسمبلی یا پارلیمنٹ ایک قانون بناتی ہے، وہ طبقہ جس کا وہاں غلبہ اور اکثریت ہوتی ہے۔ قانون سازی میں اپنے مفادات پر نگاہ رکھتا ہے۔ اگر انصاف ان کی راہ میں حائل ہوتا ہے تو تاویلات کے پردوں میں اسے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آمریت اور فاشزم میں شخصِ واحد کی انانیت، قانونِ قومی کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے۔ اگر کوئی سرمایہ دار کی بے جا حفاظت کرتا ہے۔ تو کمیونسٹ "مزدور کسان" کی حدود سے بڑھ کر رعایت کرتے ہیں۔ قانون تو وہی عادلانہ ہوگا جس میں کسی کی رعایت نہ ہو۔ ملکی رجحان نہ ہو۔ نسلی میلان نہ ہو۔ لونی پاس نہ ہو۔ علاقائی لحاظ نہ ہو۔ وطنی مفاد نہ ہو۔ طبقاتی عصبیت نہ ہو۔ غیر سے مخاصمت نہ ہو۔ اپنے کی حمایت نہ ہو۔ کینہ پروری نہ ہو، دوست نوازی نہ ہو۔ "مفادات خاصہ" کی ناجائز نگرانی نہ ہو۔ قانون سازی میں مال و جاہ کی طلب نہ ہو۔ مدح و ذم کی پرواہ نہ ہو۔

غرض تمام مفادات سے بالا ہو کر اور ہر "رجحان" سے "تہی خاطر" و خالی دماغ ہو کر محض عدل و انصاف کی بقا کے لئے قانون بنانا یہ انسان کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ یہ تو اس ذات کا کام ہے۔ جو سب تعلقات سے بری، نہ کسی کا بیٹا نہ کسی کا باپ نہ کسی کا رشتہ دار ہو۔ ہر انفعال سے پاک ہو۔ خوف و رعایت سے مبرّا۔ نسلی و لونی ملکی و وطنی بندشوں سے پاک ہو۔ اور وہ ذات

انسان کے غوامض و اندرون اس کی جملہ ضروریات انفرادی و اجتماعی سے کلیۃً واقف ہو وہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکات ہے۔

اللہ تعالیٰ جو قانون دے گا۔ وہ سب انسانیت بلکہ پوری مخلوق کو سامنے رکھ کر اور مستقبل کے وقائع و احوال کو جان کر دے گا۔ جس میں کسی کی رعایت نہیں ہوگی۔ نہ کسی کا "خوف" عدل میں مانع آیا ہوگا۔ وہ ہر ذاتی مفاد سے خالی ہو کر محض مخلوق پروری اور انسانیت کی دادرسی کے لئے دیا جائے گا۔ اس میں کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ اس میں استحصال و جبر کے چور دروازے نہیں ہوں گے۔ اقبال نے بھی قانون الٰہی اور "قانون غیر" کے بارے میں خوب کہا ہے ؎

وحی حق بینندۂ سود ہمہ — در نگاہش سود و بہبود ہمہ
عادل اندر صلح و اندر مصاف — وصل و فصلش لایراعی لایخاف
عقل خود بین غافل از بہبود غیر — سود خود بیند نہ بیند سود غیر
غیر حق چون ناہی و آمر شود — زور ور بر ناتوان قاہر شود
حاصل آئین و دستور ملوک — دہ خدایان فربہ دہقان چون دوک

غرض ملک میں عدل و انصاف کا چلن صرف اسلامی شریعت کے نفاذ سے ہو سکتا ہے تعمیرِ نو میں مذہبی قانون کے نفاذ کی اس وجہ سے بھی ضرورت ہے کہ "قانون" کی بالادستی کا تصور احترام قانون پر مبنی ہے۔ اور وہ قانون صرف "خدائی قانون" ہی ہے۔ جسے پاکستان کے مسلمان غیر شعوری طور پر بھی مقدس مانتے ہیں۔ قانونِ اسلامی کے جملہ فوائد بیان کرنے کی گنجائش نہیں۔ تاہم سمجھتا ہوں کہ یہ دو باتیں بھی تعمیرِ نو کے علم برداروں کی ثاقب نگاہوں کے لئے کافی ہوں گی ؎

اے چشم طوفان اشک لانے سے فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

■■

پی - سی - ٹی — مارکہ — پرزہ جات سائیکل
پاکستان میں سب سے اعلیٰ اور معیاری
بٹ سائیکل سٹور نیلا گنبد لاہور — فون نمبر 65309

سوالنامہ کے جواب میں

سلسلہ نمبر ۲

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب
مفتی اعظم پاکستان۔ صدر دارالعلوم کراچی

میری علمی و مطالعاتی زندگی

★

کرم فرمائے محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ نے مجھ ناکارہ کی علمی زندگی کے بارہ میں کچھ سوالات کئے ہیں۔ میں علم وعمل سے تہی دامن اسکا جواب کیا دیتا یہ خود ایک مسئلہ بنا ہوا تھا جسکی وجہ سے جواب میں تاخیر ہوئی۔ آپ نے مولوی محمد تقی سلمہٗ کو مسلط فرما دیا جو جواب کے لئے یاد دہانی کیساتھ تاکید بھی کرتے رہے۔ آج مجبور ہوکر یہ سطور لکھ رہا ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی علمی اور عملی زندگی کے جس باب اور جس پہلو پر نظر ڈالتا ہوں سب کوتاہیوں اور لغزشوں اور غفلتوں سے لبریز نظر آتے ہیں۔ ان حالات میں میں دوسروں کو کیا بتاؤں۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے انعامات اس ناکارہ پر بے حد و بے شمار ہوئے ان میں سب سے بڑا احسان یہ کہ اس نے ایک ایسے گھرانہ میں پیدا کر دیا جو اسلام و ایمان اور اس کے ساتھ دینداری میں معروف تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا دین کی باتیں بزرگوں کی حکایتیں کان میں پڑتی رہیں۔ اس کے بعد سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے ایک ایسی جگہ پیدا فرما دیا جو علم اور دین کے اعتبار سے پورے ملک میں بلکہ شاید پوری دنیا میں ایک امتیازی مقام رکھتا تھا۔ یعنی دیوبند۔ جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے برگزیدہ ایسے راسخ العلم محقق علماء کو جمع فرما دیا تھا۔ جو علم کے ساتھ عمل اور تحقیق کے ساتھ اعتدال اور بلند نظری کیساتھ اپنے زمانے کے حالات پر گہری نظر رکھنے والے تھے، وہ علماء ربانی صرف علماء نہیں۔ اولیاء اللہ بھی تھے، والد ماجد اسی دارالعلوم میں علمی عملی تربیت پاکر اس کے مدرس کی حیثیت میں تھے۔

قدرت نے اس سوال کی زحمت ہی سے بچا دیا کہ بچے کو تعلیم کے لئے کہاں بھیجیں۔ جب تک پڑھنے کے قابل نہ تھا۔ اس وقت بھی دارالعلوم کا صحن میرے کھیلنے کی جگہ تھی۔ ہر طرف علماء صلحاء ہی پر نظر پڑتی تھی۔ کوئی بھی بات کان میں پڑتی تو انہی بزرگوں کی۔۔۔۔

سنہ ۱۳۲۰ھ میں جبکہ عمر کا ساتواں سال تھا۔ باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی اور سنہ ۱۳۶۲ھ تک اسی گہوارۂ علم وعمل میں رہنے کی توفیق ملی۔ میری علمی عملی زندگی کے

کہ ہر گوشہ میں کوئی چیز کام کی ہے تو وہ سب ان بزرگوں کا فیض نظر ہے۔ میرا اپنا کچھ نہیں، عامہ مسلمانوں اور طلباء و علماء کیلئے کچھ مفید باتیں، اور کلمات حکمت انہی بزرگوں سے سنے سنائے ہیں جن کو اپنے لئے بھی سرمایۂ سعادت سمجھتا ہوں۔ اور دوسرے اہل علم دوستوں کو بھی ان کا پہنچانا مفید سمجھ کر لکھتا ہوں۔ اسکی معافی چاہتا ہوں کہ آپ کے سوالات کی ترتیب پر اس کے جوابات نہیں، مگر امید ہے کہ مقصد سوالات پر نظر کی جائے تو اس میں ان کے کافی جواب ملیں گے۔

مطالعہ کتب | ۱۔ اصل یہ ہے کہ انسان کا معلّم درحقیقت انسان ہی ہو سکتا ہے، کوئی کتاب خود معلّم نہیں ہوتی، البتہ تعلیم تعلّم میں معین ضرور ہوتی ہے۔ اس لئے اصول کی بات یہ ہے کہ جس علم و فن کو حاصل کرنا مقصود ہو اس کا ماہر محقق استاد تلاش کیا جائے۔ اور جب وہ مل جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت سمجھ کر اس سے اکتساب علم میں مشغول ہو، کسی کتاب کا مطالعہ بھی کیا جائے تو اسی معلّم کی تجویز سے، تاکہ وہ اس کی استعداد اور ضرورت پر نظر کرکے اس کے لئے مطالعہ کی کتابیں تجویز کرے۔ خود رائی سے مختلف کتابوں کا مطالعہ وقت اور محنت بہت لے گا، فائدہ اتنا نہیں ہوگا۔ آجکل مدارس عربیہ میں استاد

سوالنامہ

۱۔ آپ کو علمی زندگی میں کن کتابوں اور مصنفین نے متاثر کیا اور آپ کی محسن کتابوں نے آپ پر کیا نقوش چھوڑے۔؟

۲۔ ایسی کتابوں اور مصنفین کی خصوصیت۔

۳۔ کن مجلات اور جرائد سے آپ کو شغف رہا۔ موجودہ صحافت میں کون سے جرائد آپ کے معیار پر پورے اترتے ہیں۔؟

۴۔ آپ نے تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ اور درسگاہوں سے خاص اثرات لئے۔ ایسے اساتذہ اور درسگاہوں کے امتیازی اوصاف جن سے طلباء کی تعمیر و تربیت میں مدد ملی۔

۵۔ اس وقت عالم اسلام کو جن جدید مسائل اور حوادث و نوازل کا سامنا ہے۔ اس کے لئے قدیم یا معاصر اہل علم میں سے کن حضرات کی تصانیف کارآمد اور مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔۔؟

۶۔ علمی، فکری اور دینی محاذوں پر کئی فتنے تحریفی، الحادی اور تجددی رنگ میں (مثلاً انکار حدیث، عقلیت، اباحیت، تجدد، مغربیت، قادیانیت اور سائنٹزم) مصروف ہیں۔ ان کی سنجیدہ علمی احتساب میں کونسی کتابیں حق کے متلاشی نوجوان ذہن کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔۔۔؟

۷۔ موجودہ سائنسی اور معاشی مسائل میں کونسی کتابیں اسلام کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔

۸۔ مدارس عربیہ کے موجودہ نصاب اور نظام میں وہ کونسی تبدیلیاں ہیں جو اسے موثر اور مفید تر بنا سکتی ہیں۔

—— امید ہے اپنے مفید خیالات سے محروم نہیں کیا جائے گا ——

کا انتخاب طالب علم خود نہیں کر سکتا تو طالب علم کم از کم یہی کر سکے کہ ایسے مدرسہ کا انتخاب کرے جہاں وہ کتابیں جو اسکو پڑھنا ہیں ان کے ماہر اساتذہ کے سپرد ہوں۔ پھر جس استاد کو اپنے مطلوب فن میں زیادہ ماہر سمجھے اس سے استفادہ کا سلسلہ قائم کرے خواہ سبق اس کے پاس ہو یا نہ ہو۔

۲- اس زمانہ میں تصنیف تالیف کتابوں کی اشاعت اتنی عام ہے کہ احاطہ دشوار ہے۔ ہر اہل و نااہل تصنیف میں لگا ہوا ہے۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں، جو قرآن و سنت میں تحریف کرتے ہیں، اور بے دین و ملحد بھی ہیں، اس لئے اس زمانے میں کتابوں کے مطالعہ کیلئے مناسب صورت یہ ہے کہ عوام کسی عالم سے اپنے مناسب حال کتابیں مطالعہ کی تجویز کرائیں۔ اور طلباء اپنے اساتذہ سے۔ اور جہاں مطالعہ میں کوئی اشکال پیش آئے اسکو اپنی رائے سے طے نہ کریں، بلکہ عوام علماء سے اور طلباء اساتذہ سے تحقیق کر کے رفع کریں۔

اگر یہ طریق اختیار نہ کیا گیا تو بیشمار کتابیں دیکھنے اور بڑی محنت کرنے کے بعد کچھ علم آئے گا وہ بھی قابل اطمینان و اعتماد نہیں ہوگا۔

۳- جس کتاب کا مطالعہ کرنا ہو پہلے اس کے مصنف کا حال معلوم کیجئے کہ جس موضوع پر یہ کتاب ہے اس فن میں مصنف کی مہارت کس حد تک ہے۔ اگر مصنف ہی کی مہارت فن کی تحقیق نہ ہو تو اپنے وقت اور محنت کو اس کے پیچھے ضائع نہ کریں۔ اور اگر کتاب دینیات سے متعلق ہے تو مصنف کے علمی مقام کے ساتھ اس کی عملی اور اخلاقی زندگی کی بھی تحقیق مناسب ہے۔ کیونکہ تجربہ شاہد ہے کہ علوم دین میں بے عمل آدمی کی تصنیف اور کلام میں وہ اثر نہیں ہوتا جو متقی علماء کی تصانیف میں ہے۔

۴- عام مسلمان جو دین کا کافی علم نہ رکھتے ہوں وہ فرق باطلہ کی کتابیں اور ملحدین اور بے دین لوگوں کے مضامین ہرگز نہ دیکھیں کہ جسطرح بے دینوں کی مجالست اور صحبت برا اثر ڈالتی ہے اسی طرح ان کا کلام اور تصنیف بھی۔ بلکہ بعض اوقات اس کا اثر صحبت و مجالست سے بھی زیادہ مضر ہوتا ہے۔

۵- اہل علم میں بھی صرف وہ حضرات ملحدین اور فرق باطلہ کی کتابوں کا مطالعہ کریں جنکو ماہر اساتذہ کی صحبت سے علم میں رسوخ حاصل ہو چکا ہے۔ اور وہ اپنے وسائل کے اعتبار سے دفاع عن الاسلام کی خدمت انجام دینے کی صلاحیت بھی رکھتے ہوں۔ مثلاً تحریر، تقریر اس درجہ میں ہو کہ حق بات کو دلنشین انداز میں فریق مخالف کے نفسیات پر مؤثر کر کے بیان کر سکیں۔ جو لوگ یا اتنی استعداد نہیں رکھتے۔ یا ان کو ایسے لوگوں سے سابقہ نہیں پڑتا، وہ فضول اپنا وقت اور محنت ان کتابوں کے مطالعہ

میں صرف کرنیکی بجائے ان کتابوں کا مطالعہ کریں جو اپنے لئے بھی اصلاح نفس کا ذریعہ بنیں اور دوسرے مسلمانوں کو بھی ان کی تعلیم و تبلیغ مفید ہو۔

ہمارے اکابرؒ فرمایا کرتے تھے کہ درس نظامی سے فراغت کا حاصل اتنا ہے کہ اس کے فاضل میں مطالعہ کی ایسی استعداد پیدا ہوگئی ہے کہ استاد کی مدد کے بغیر بھی مطالعہ کرکے استفادہ صحیح کرسکتا ہے۔ یہ نہیں کہ ضرورت کے سب علوم اور سب معلومات درس نظامی میں پورے حاصل ہوچکے یہ ایک ایسی بات ہے جو اکثر درس نظامی کے فارغ التحصیل لوگ نظر انداز کردیتے ہیں۔ اس لئے ایک عالم کے شایان شان خدمت میں کامیاب نہیں ہوتے۔ ایسے علوم میں خصوصیت سے تاریخ، جغرافیہ اور تصوف ہے۔ جو درس نظامی میں درساً نہیں پڑھائے جاتے لیکن درس نظامی کی صحیح استعداد پیدا کرلینے والا انکو مطالعہ کرکے اسی طرح سمجھ سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ مدارس سے فارغ التحصیل حضرات ان فنون کا مطالعہ اہتمام سے کریں۔ خصوصاً تصوف یعنی اصلاح نفس سے متعلق کتابوں کے مطالعہ کو وظیفہ زندگی بنائیں جس کے بغیر علم دین کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ نہ تعلیم و تبلیغ میں برکت پیدا ہوتی ہے۔ اس معاملہ میں امام غزالیؒ کی کتابیں عموماً اور بالخصوص بدایۃ المبتدی، تعلیم دین، فاتحۃ العلوم اور احیاء العلوم کی جلد رابع، علامہ ابن قیم کی کتاب ——— الجواب الکافی عن الدواء الشافی، اور کتب متقدمین میں سے رسالہ قشیریہ اور عوارف المعارف وغیرہ اور آخری دور میں حکیم الامت سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کی تصانیف تعلیم الدین، التشرف، قصد السبیل، اماثل الاقوال وغیرہ اور آپ کے مطبوعہ مواعظ و ملفوظات اس معاملہ میں اکسیر ثابت ہوئے ہیں۔

رہا معاملہ موجودہ نصاب مدارس میں اصلاح و ترمیم کا تو اس کے لئے انفرادی رائیوں کی اشاعت شاید مفید نہ ہو۔ یہ کام مدارس عربیہ کے ذمہ داروں کے اشتراک اور باہمی بحث و تمحیص کے بعد ہی کوئی مفید صورت اختیار کرسکتا جس سے مدارس عربیہ کے نصاب میں ہم آہنگی اور اشتراک باقی رہے۔

آپ کے سوالات میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ "آپ نے تعلیمی زندگی میں کن اساتذہ اور درسگاہوں سے خاص اثرات لئے، ایسے اساتذہ اور درسگاہوں کے امتیازی اوصاف۔"

اس میں جہاں تک درسگاہوں کا تعلق ہے وہ اوپر عرض کرچکا ہوں کہ صرف ایک درسگاہ دارالعلوم دیوبند میں بچپن سے پچپن ۵۵ تک عمر گذاری ہے اس کی خصوصیات محتاج بیان نہیں۔ ہندوستان و پاکستان میں اور بیرونی ممالک میں بھی اسکی علمی ساکھ ہمیشہ مسلم رہی ہے اور جس چیز نے اسکو دنیا کی دوسری درسگاہوں سے ممتاز کیا وہ علم کے ساتھ عمل کی جامعیت ہے۔ میرے والد ماجد مولانا محمد یسین صاحبؒ فرماتے تھے

کہ ہم نے دار العلوم کا وہ زمانہ دیکھا جبکہ اس کے مہتمم اور صدر مدرس مدرسین سے لیکر ایک چپراسی اور دربان تک سب اولیاء اللہ تھے۔ دار العلوم دن بھر قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے گونجتا تھا۔ تو رات کو جگہ جگہ سے تہجد میں تلاوتِ قرآن اور ذکر اللہ کی دلنواز صدائیں سنائی دیتی تھیں۔ اور اساتذہ جن کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کی دولت حق تعالیٰ نے اس ناکارہ کو نصیب فرمائی، ان کے امتیازی اوصاف بیان کرنا تو اس ناکارہ کے بس کی بات نہیں۔ قلم جب یہاں پہنچتا ہے تو ایک طرف محبت کا داعیہ قلم کے افتاد کو خود بخود تیز کرنا چاہتا ہے ۔

این زمان جان دامنم را تافت ست
بوئے پیراہان یوسف یافت ست

دوسری طرف ان بزرگوں کی عظمت اور ان کے کمالات علمی و عملی کی وسعت سے اپنے دامنِ فکر و نظر کو تنگ پاتا ہوں۔ خصوصاً اس وقت جبکہ میرے سب قوی جواب دے چکے ہیں۔ عمر کے آخری ایام لیٹ بیٹھ کر گذار رہا ہوں۔

ذرا غور کیجئے کہ ان حالات میں اپنے اساتذہ شیخ العرب والعجم استاذ الکل حضرت مولانا محمود الحسن شیخ الہند نور اللہ مرقدہ حجۃ الاسلام والمسلمین حضرۃ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ اور عارف باللہ حضرۃ مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ، عالم ربانی حضرت مولانا سید اصغر حسین میاں صاحب۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ۔ اور دوسرے طبقہ میں حضرۃ مولانا اعزاز علی صاحب حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب۔ حضرت مولانا رسول خاں صاحب جیسے اساطین امت بزرگوں کے امتیازی اوصاف پر قلم اٹھاؤں تو سمندر کو تیراکی کے ذریعہ پار کرنے کی مثال سے کیا کم ہوگی۔ اس وقت تو بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ ع آفتاب آمد دلیل آفتاب۔

اور یہ کہ ۔

تولائے مرداں ایں پاک بوم
برانگیختم خاطر از شام و روم

اور یہ کہ ۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
رفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

اللہ تعالیٰ ان بزرگوں کی معیت آخرت میں نصیب فرمادیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔ ★

★ میری علمی و مطالعاتی زندگی کے زیر عنوان اگلے شمارہ میں عالم اسلام کی ممتاز علمی دینی اور ادبی شخصیت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کا طویل بیان ملاحظہ فرمائیں۔

★ مضمون نگار حضرات کی خدمت میں مودبانہ گذارش ہے کہ الحق کے مضامین کا مسودہ کاغذ کے ایک طرف خوشخط لکھ کر بھجوائیں۔ اس سے عمدہ کتابت اور دلکش ترتیب میں بڑی مدد ملتی ہے۔

(کاتب الحق)

ارشادات شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہٗ

علماء کا اصل کام
اصلاحِ امت

یہ تقریر حضرت شیخ الحدیث مدظلہٗ نے ۲۹ راپریل ۱۹۷۲ء کو دیہی ترقیاتی اکیڈمی پشاور کے دو روزہ علماء کنونشن میں ارشاد فرمائی اور بڑی خوبی سے کنونشن میں شریک علماء کا رخ علماء کے کرنے کا اصل کام اصلاحِ امت اور فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی کی طرف موڑ دیا۔

(ادارہ)

(نحمدہ ونصلی) قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم العلماء ورثۃ الانبیاء۔ (الحدیث)

حضورؐ نے فرمایا علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں۔

محترم بزرگو! علماء کا اونچا مقام ہے۔ خواص امت محمدیہ علی صاحبہا الف الف سلام وتحیۃ کے علماء کا جو حضورؐ کے ارشاد علماء امتی کانبیاءِ بنی اسرائیل کے مصداق ہیں۔ اور وارث کو وہ چیز میراث میں ملتی ہے جو مورث کے پاس ہوا۔ دولت جس نے حاصل کی وہ قارون کا وارث بنا سلطنت اور حکومت تو فرعون ہامان اور ہلاکو مسولینی کو بھی ملی۔ اگر کسی نے صرف یہ چیزیں حاصل کیں تو ان کی میراث کو پالیا، مگر وہ پیغمبر کا وارث نہیں ہو سکتا۔

ہمارے آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم فداہ ابی وامی نے ایسے حالات میں مکہ مکرمہ میں حق کی آواز بلند کی۔ کفار لالچ دیتے رہے۔ حضرت ابوطالب کے پاس جاکر شکایت کرتے۔ حضورؐ اپنے چچا کو کہتے کہ میری وجہ سے قوم کا بوجھ مت اٹھائیں، میں اللہ کے بھروسہ اور اعتماد پر کھڑا ہوا ہوں۔ اور اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں سورج اور دوسرے میں چاند بھی رکھ دیں اور کہہ دیں کہ ایک ایسی راہ اختیار کر لوں جو ذرا سی بھی اعتدال سے ہٹی ہوئی ہو تو ہرگز نہ کر سکوں گا۔

قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاء نفسی ان اتبع الا ما یوحیٰ الیّ

مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ دین کی کسی بات کو اپنی مرضی سے تبدیل کر سکوں میں تو اسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے۔

پھر اس امت نے حضورؐ کے ایسے نمونوں اور اصولوں کو اپنا کر قرآن وسنت کی برکت سے قیصر و کسریٰ کی سلطنت ختم کی تو اولین امت کی اصلاح جن طریقوں سے ہوئی انہی طریقوں سے ہماری حالت بھی بدل سکتی ہے۔ انہوں نے کالج اور یونیورسٹیاں نہیں پڑھی تھیں کارخانے نہ تھے، بدر میں چند تلواریں اور چند کمان مسلمانوں کا سارا اثاثہ تھے۔ مگر ان کے جذبات یہ تھے کہ حضورؐ نے جب بدر میں رائے معلوم کرنا چاہی کہ تم ۳۱۳ ہو کفار تمام السلاح اور شاکی السلاح ہیں، کیا خیال ہے۔ ان سے مقابلہ ہو جائے یا نہیں ـــ؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ہم بنی اسرائیل کیطرح نہیں کہ آپ کو کہہ دیں کہ اذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون۔ (تو اور تیرا رب جاکر لڑے ہم تو یہاں ہی بیٹھے رہیں گے۔) نہیں بلکہ انا نقاتلک عن یمینک وعن شمالک وعن یسارک ـــ الخ ہم تو آپ کے آگے پیچھے دائیں بائیں لڑیں گے۔ تو فتح بھی خدا نے دی کہ اس کا وعدہ ہے کہ: ان تنصروا اللہ ینصرکم۔ اگر تم اللہ کے دین کی مدد کروگے۔ تو اللہ تمہاری نصرت کرے گا۔ تم خدا کی مدد کیلئے کمربستہ ہو جاؤ، خدا تمہاری مدد کرے گا۔ اگر یہ خیال ہو کہ شاید اس وقت دشمن موجودہ زمانہ کی طرح کا طاقتور اور مسلح نہ ہوگا۔ تو نہیں۔ اپنی تاریخ پڑھ لو۔ ایک جنگ یرموک میں لاکھوں مسلح کافروں سے مقابلہ ہوا، کئی ہزار زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے کہ بھاگنا بھی چاہیں تو نہ بھاگ سکیں۔ لوہے کی دیوار بن گئے تھے۔ ان کے پاس طاقت تھی۔ مگر مسلمانوں نے ان کی صفوں کو تہس نہس کر دیا تھا۔ اُس وقت اللہ کی مدد مسلمانوں کے ساتھ رہی۔

ـــ تو بھائیو! آپ کا مقام بہت اونچا ہے۔ ان فتنوں کے دور میں گھبرائیں نہیں۔ صحابہ کرامؓ کی حالت سامنے رکھیں کہ وہ حضورؐ کے سچے وارث تھے۔ حضرت خبابؓ کی پیٹھ ایک دفعہ ننگی ہوگئی، حضرت عمرؓ موجود تھے دیکھا تو ایسے زخموں کے نشان تھے کہ نہ تیروں کے معلوم ہوتے تھے، نہ تلوار کے بڑے بڑے چھالے اور گڑھے سے بن گئے تھے، وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میرا مالک میرے اسلام لانے کی وجہ سے مجھے دہکتے انگاروں پر لٹا دیتا۔ اوپر چند آدمی بٹھا دیتا کہ اٹھ کر بھاگ نہ سکوں۔ اور جسم سے خون اور پانی رس رس کر جب تک انگاروں کو بجھا نہ دیتا تب تک مجھے اسی حالت میں رکھا جاتا۔ انہی حضرت خبابؓ کا سر مبارک دشمن کے ہاتھوں زخمی ہوا! حضورؐ سے شکایت کی، حضورؐ کا چہرہ مبارک سرخ ہوا اور فرمایا۔ اے خباب، تم تو خیر امت میں سے ہو۔ تم سے پہلے تو اسلام کی خاطر لوگوں کو آروں سے چیرا گیا۔ مگر اُف تک نہ کی، تمہیں اتنی گھبراہٹ کیوں ہے۔ پھر حضورؐ نے فتح کی بشارت دی کہ یہاں سے صنعاء یمن تک ایک عورت اکیلے سونا لئے جارہی ہوگی اور اسے کوئی

ڈر نہیں ہوگا۔ یہی بشارت تھی کہ حضرت عمر عثمان علی رضی اللہ عنہم کا دور آگیا۔ ۲۳ سال میں اسلام کا جھنڈا گاڑ دیا۔

انا فتحنا لک فتحا مبینا۔ (ہم نے تجھے بہت بڑی فتح دی) کا ظہور ہوا۔ مگر ہم نے اپنے ملک میں وہ جھنڈا جو چودہ سو سال سے لہرا رہا تھا، ۲۴ سال میں سرنگوں کر دیا۔ اور سات کروڑ مسلمانوں کو ہندو کے سپرد کر دیا۔ پھر کہئے کیا ہم بھی وارث ہیں۔ ذات اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے لہرایا اور ہمارے سپرد کرکے حکم دیا کہ اب آگے بڑھتے رہو، مگر ہم نے ۲۴ سال میں اسلامی مملکت کا اہم حصہ کافروں کے سپرد کر دیا۔ بھائیو! آج آپ کی یہ تمام کوششیں قابل ستائش ہیں۔ مگر جب مرض کی تشخیص نہ ہو اور برائی کی جڑ نہ کاٹیں گے تو علاج کارگر نہیں ہو سکے گا۔ ہسپتال کارخانے ترقیاتی منصوبے سب کچھ ہو رہا ہے۔ ہم کہتے ہیں جزاک اللہ اور بھی ترقی کرتے رہو۔ مگر ہم دین کے خدام اور آپ حضرات علماء کا مقام اور کام تو یہی ہے کہ حضور کے دین کو لیکر امت کی اصلاح و فلاح کے لئے کمر بستہ ہو جاؤ کہ اسی طریقہ پر چل کر ہماری ترقی ہے۔ لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا۔ اس امت کا آخری دور بھی انہی طریقوں سے درست ہوگا جس طرح اگلے دور کی اصلاح ہوئی۔

یہ دو ڈھائی سو علماء کا مجمع اگر اپنے اپنے دیہات میں پھیل کر اصلاح کے کام میں لگ جائے۔ اور سب سے پہلے لوگوں کے دلوں میں خدا کے خوف کے جذبات ابھاریں کہ رأس الحکمۃ مخافۃ اللہ۔ (دانائی کی جڑ اللہ کا خوف ہے۔) تو کتنی اصلاح ہو سکتی ہے۔ قبل از اسلام عربوں کی زندگی کتنی خراب تھی کہ ہماری موجودہ خرابی بے حساب ہونے کے باوجود دور جاہلیت تک نہیں پہنچ سکتی۔ ان طریقوں سے جسے حضور نے اختیار کیا۔ ان کی ایسی اصلاح ہوگئی کہ اس معاشرہ میں سے حضرت عمرؓ اور حضرت ابوعبیدہؓ حضرت خالدؓ جیسے لوگ پیدا ہوئے۔ کوئی مادرزے تنگ، کوئی شکسپیر اور کوئی نکسن کے پیچھے جاتا ہے، تو جائے، ہمارا ماویٰ و ملجا تو ذات وحدہٗ لاشریک اور ہمارا اسوۃ و نمونہ تو اس کا پیغمبرؐ اور اس کے صحابہ کرامؓ ہیں۔ الغرض پہلا فریضہ ہمارا یہ ہے کہ ہم اپنے دیہات میں پھیل کر وراثت نبوت کا کام سنبھالیں۔ اس راہ میں کسی چیز کی پرواہ نہ کریں، نہ طمع و لالچ ہو۔ اور نہ دنیا مطمح نظر ہو۔ حضورؐ نے حق کی آواز بلند کی اور جاتے وقت دنیا پر اسلام کی سلطنت قائم فرمائی مگر دنیا سے رحلت کے وقت زرہ مبارک ایک یہودی کے پاس چند سیر جو کے عوض گروہ ہے۔ انبیاء اجر کے طلبگار نہیں ہوتے قل لا اسئلکم علیہ اجرا ان اجری الا علی رب العالمین۔ تمہیں جب علم کی دولت اور عزت حاصل ہے تو اس سے بڑھ کر عزت اور دولت کیا ہو سکتی ہے۔ لوگوں کا اس کا اندازہ نہیں

ہے۔ اس لئے اور چیزوں کو مقصود بنا دیتے ہیں۔ وللہ العزۃ ولرسولہ ولکن المنافقین لایعلمون۔
ہمارا فریضہ ہے کہ بجذبۂ اخلاص وللہیت سے اس قوم کی اصلاح میں لگ جائیں۔ اور جسطرح نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، اخلاقِ حسنہ اور احساسِ آخرت کا درس امت کو دیں۔ اسی طرح عملی نمونہ بھی ان تمام باتوں کا امت کو بتلائیں۔ اور دنیا کے کام بھی ایک مثالی نمونہ بن کر ان کے سامنے پیش کریں۔

علماء کو تجارت اور دنیوی کاموں سے بھی نہیں روکا گیا۔ مگر ان کی تجارت بھی کیسی ہو گی۔؟ امام ابوحنیفہؒ ریشم (خز) کے تاجر تھے۔ ایک بوڑھی عورت آئی، ایک ریشمی چادر خریدی، قیمت پوچھی اور کہا جس قیمت پر پڑی ہے اسی قیمت پر دیدو۔ امامؒ نے فرمایا: چار درہم۔ بڑھیا حیران رہ گئی اور کہا کہ کیوں ہنسی تمسخر کرتے ہیں۔ اتنی ہلکی قیمت بتلائی۔ فرمایا نہیں ایسا نہیں۔ میں نے دو چادریں خریدی تھیں، ایک بک گئی اور یہ چادر چار درہم میں رہ گئی ہے۔ جب تم نے اصل قیمت پر لینا چاہا! تو چار درہم ہی پہ دوں گا۔

امام بخاریؒ کے ہاں مالِ تجارت آیا۔ عصر کے بعد سوداگر آ گئے اور کہا کہ مرابحہ کر لو۔ ۵ ہزار نفع دیتے ہیں۔ فرمایا کل تک رہنے دو۔ وہ لوگ واپس گئے۔ کل اور مشتری آئے اور دس ہزار نفع پیش کیا اسی مال کا۔ امامؒ نے فرمایا نہیں دس ہزار نہیں لے سکتا۔ کل شام دو چار تاجر مجھے ۵ ہزار روپیہ منافع دینے لگے تھے۔ گو عقد نہیں ہوا تھا۔ مگر میرا قلبی میلان دینے کا ہو گیا تھا، تو اب انہیں ۵ ہزار ہی پہ دوں گا۔ دس ہزار پہ نہیں دے سکتا۔ تو یہ ہے عالم کی شان۔

اسی طرح مواریث الانبیاء (علم اور علومِ نبوت اور سیرتِ طیبہ) کا وقار رکھنے، صرف اللہ کی رضا مدِ نظر رہے۔ علم کو ذلیل نہ ہونے دیں۔ امام بخاریؒ کو حاکمِ بخارا دعوت دیتا ہے کہ میرے پاس آ کر مجھے درس دیا کریں۔ جواب میں کہا کہ یہ علم بڑی اشرف چیز ہے۔ اس کے پیچھے لوگ آتے ہیں۔ علم کسی کے پیچھے نہیں پھرتا، بادشاہ نے کہا کہ میرے شہزادوں کو ایک سپیشل کلاس دو جس میں عام لوگ اور پردیسی غریب الدیار طلبہ نہ ہوں۔ فرمایا یہ حضورؐ کی میراث ہے۔ جنہیں اللہ نے حکم دیا تھا کہ:

واصبر نفسك مع الذين يدعون	ان لوگوں کے ساتھ اپنے نفس کو روکے رکھو جو
ربهم بالغداة والعشي يريدون	صبح شام اللہ کی رضا کے لئے اسے پکارتے
وجهه۔	ہیں۔ (اور ذکر و فکر ہی ان کا مشغلہ ہے)

تو اس میں یہ تقسیم نہیں کر سکتا۔ امیر بخارا خفا ہو گیا اور بخارا سے جلاوطنی کا حکم صادر کیا۔ امامؒ چلے گئے اور باہر ہی دفن ہوئے۔ مگر وقارِ علمی قائم رکھا۔ امام ابوحنیفہؓ ایک طرف دین کی اشاعت میں لگے رہے۔

دوسری طرف درستہ کھا کہ دین کی حفاظت کی۔

بھائیو! ملت کی خیر خواہی ہمارا سب سے اہم فریضہ ہے۔ ہم پہ دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آدھا ملک چلا گیا ہے۔ اس شرمناک شکست کی وجہ سے جو ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ مگر بہت سے جاہل اذہان اس حادثہ سے اسلام سے پھرنے لگے ہیں۔ حالانکہ یہ اسلام کی شکست نہیں تھی۔ ہمیں لوگوں کی اصلاح کرنی ہے۔ اور لوگوں کے عقائد کو سنبھالا دینا ہے، وہ کتاب اور وہ سنت پھیلانی ہے جس کی وجہ سے ہمارے اسلاف دنیا و آخرت میں سرخرو ہو گئے۔ اسلام کے اخلاق و اقدار پیش کریں۔ اسلام کی تجارت اسلام کی زراعت پیش کریں۔ اسلام کا طرز حکومت پیش کریں۔ اللہ تعالیٰ جو بے حد مہربان ہیں۔ ایسا ہی رحم فرما دیں گے جیسے اگلوں پر فرمایا۔

میری دعا ہے کہ دیہی ترقیاتی اکیڈمی کے ان مساعی کو بھی اللہ تعالیٰ دین و ملک کے لئے مفید بنا دے۔ قومی تعمیر تو بہت بہتر ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ قوم کو نئے تمدن اور نئی تہذیب کے سانچوں میں ڈالدیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہونا چاہیئے کہ انگریز کے وقت سے لیکر اب تک عیسائیت، مغربیت اور لادینی کے جتنے بھی اثرات پیدا ہوئے ہیں۔ ان کو مٹا دیا جائے اور حضورؐ کے لائے ہوئے دین اور شریعت کے مطابق فرد اور معاشرہ کی تعمیر کی جائے۔ چودہ سو سال قبل کا دین اپنایا جائے جس کی بدولت ہمیں عزت اور کامرانی ملی تھی۔ اور صحابہؓ نے جس دین کے اخلاق عقائد عبادات اور طہارت ظاہر و باطن کے ذریعہ امداد خداوندی کی قوت حاصل کی اور حضورؐ نے تو ہماری حالت پر رحم فرماتے ہوئے یہاں تک فرمایا کہ میرے صحابہؓ نے اگر کسی مامور بہ کا دسواں حصہ بھی چھوڑا تو ماخوذ ہوں گے۔

——— اور ان کے بعد آنے والوں نے اگر مامور بہ کے دسواں حصہ پر بھی عمل کیا۔ یعنی ۱/۱۰ درجے کا اخلاص بھی، اگر عمل میں ہو تو کامیابی کا باعث ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ فرائض اور واجبات کے ۹ حصے چھوڑے۔ نہیں۔ بلکہ صحابہؓ کے عمل میں دس کے دس حصے اخلاص ضروری تھا۔ ہم اتنے مخلص نہیں ہو سکتے اور ۱/۱۰ حصے اخلاص بھی آجائے تو انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

نادر قلمی مطبوعہ کتابوں کا مرکز

چیدیار کتب خانہ گجرات

مولانا قاضی عبدالکریم صاحب امیر جمعیۃ العلماء اسلام
ڈیرہ اسماعیل خان
مہتمم مدرسہ نجم المدارس کلاچی

کیا عائلی قوانین قرآن وسنّت کے مطابق ہیں؟

محترم وزیر قانون کے نام کھلا خط ۔۔۔!

اس حقیقت سے انکار کی کوئی بھی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ شرمناک شکست کے بعد عوام کے دینی جذبات کا خیال رکھنا کسی بھی کامیاب حکومت کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مشرق پشاور مورخہ ۲/۱۲ کے مطابق آپ نے ڈیرہ بار ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے۔ غالباً اس احساس کے پیش نظر یہ فرمایا ہے کہ پیپلز پارٹی قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنائے گی۔ اخبارات کے مطابق سندھ بلوچستان ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن میں بھی آپ نے اسی قسم کا اعلان کیا ہے۔ لیکن ڈیرہ بار ایسوسی ایشن میں اسی اعلان کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ عائلی قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

ایک سانس میں یہ دو اعلان کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا، اور عائلی قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی، قول وعمل میں یا دو باتوں میں تضاد کا عجیب سا شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ آپ جیسی باخبر عوامی شخصیت کو مردود زمانہ عائلی قوانین سے متعلق عوام کے دینی جذبات کا علم نہ ہو۔ سابق صدر ایوب کی جابرانہ مارشل لاء کی موجودگی میں عوام نے ان قوانین سے جسطرح کھلی نفرت کا اظہار کیا۔ اور ان رسوائے زمانہ قوانین کا جس طرح عملی بائیکاٹ کیا۔ شاید ہی وہ کسی سے پوشیدہ ہو۔ یہ قرآن وسنت سے ان قوانین کا کھلے طور پر منافی ہونا نہ صرف یہ کہ مجمل طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کے ایک ایک دفعہ کو قرآن وسنت اور مذاہب اربعہ کے منافی ہونے پر مفصل بحث ہوئی پمفلٹوں اور رسالوں کی شکل میں انہیں شائع کیا گیا۔ اخبارات میں اور دینی ماہناموں میں اسے چھاپا گیا قومی اسمبلی میں مفتی محمود صاحب نے سترمنٹ تک اس پر بحث کی جسے سپیکر نے فاضلانہ تقریر قرار دیا۔ اور

نتیجۃً پوری اسمبلی نے اس کے خلاف اسلام ہونے کو مان لیا۔ بین الاسلامی کانفرنس میں اس پر بحث ہوئی اور مخالفین کو دلائل کے لحاظ سے خاموش ہونا پڑا۔ اس کے باوجود کتنی تعجب کی بات ہے کہ اس دعویٰ کے ساتھ ساتھ کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا۔ کھلے خط پر یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ عائلی قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔

عائلی قوانین کے خلاف عوامی جذبات کا سرسری جائزہ

۱۔ ان قوانین کی ایک ہی دفعہ صغیر السن بچوں اور بچیوں کی شادی (ساردا ایکٹ) کا جو حشر انگریز کے زمانہ میں ہوا۔ اور دنیائے اسلام کے مایۂ ناز وسیع النظر شخصیتوں امیر الہند والحجاز شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ مفتی اعظم حضرت مولانا محمد کفایت اللہ صاحب دہلویؒ امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ وغیرہم نے ان قوانین کو جو بھرپور مخالفت کی وہ ہند و پاک کے کسی مسلمان سے پوشیدہ نہیں ہے۔

۲۔ ۱۹۵۶ء میں ایک کمیشن نے جب انہیں قوانین کا مسودہ پیش کیا تو کون نہیں جانتا کہ عوامی زبردست احتجاج سے خائف ہو کر حکومت نے اسے سرد خانہ میں ڈال دیا۔

۳۔ صدر ایوب کی جابرانہ مارشل لاء کے باوجود ۲۵ ۴/۶۲ کو شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ ہزاروں علماء کی سرکردگی کرتے ہوئے لاہور میں جلسۂ عام کے دوران اعلان فرماتے ہیں: "او ایوب خان سن لو اگر تم ان غیر اسلامی عائلی قوانین اور خاندانی منصوبہ بندی کو منسوخ نہیں کروگے تو پوری قوم انہیں ٹھکرا دے گی۔"

۴۔ علماء اسلام نے مسلک ومشرب سیاست حتیٰ کہ مذہب میں مختلف ہونے کے باوجود سب نے بالاتفاق انہیں مردود قرار دیا۔

۵۔ سینکڑوں بی ڈی ممبروں کے ایک عظیم کونشن منعقدہ لاہور میں اس کے خلاف سخت احتجاج ہوا۔ اخبارات کے مطابق اس احتجاج میں سخت اشتعال تھا۔

۶۔ قومی اسمبلی کے تمام ارکین بشمول حزب اقتدار نے مولانا مفتی محمود صاحب کی فاضلانہ تقریر کے بعد ان قوانین کے خلاف اسلام ہونے کو مان لیا۔ اور اس میں علماء کے مشورے سے ہی ترمیمات کا بل پیش کیا۔ اگرچہ حکومتوں کے روایتی دوغلا پن کی وجہ سے آخر تک اس عہد کو پورا نہیں کیا گیا۔ (ملاحظہ ہو قومی اسمبلی منعقدہ راولپنڈی کے اجلاس کی کارروائی۔)

۷۔ مغربی پاکستان کے تمام اراکین نے مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی کی تحریک پر ان قوانین کو ختم کرنے کی متفقہ پر زور سفارش کی۔ (ملاحظہ ہو صوبائی اسمبلی ۱۳ر جولائی ۱۹۶۳ء کی کارروائی)

۸۔ سرحد سے جماعت ناجیہ نے سینکڑوں بی ڈی ممبروں اور لاکھوں مسلمانوں کے دستخطوں سے اس کے خلاف محضر نامہ تیار کر کے صدر کو بھیجا۔

۹۔ دینی ماہناموں اور ہفت روزوں نے اس کے خلاف پر زور اداریئے لکھے۔

۱۰۔ سرحد اور بلوچستان میں خصوصیت سے ان قوانین کا عملی بائیکاٹ کیا گیا۔ آج بھی اگر صحیح طریقہ سے تحقیق کرائی جائے تو معلوم ہوگا کہ کئی یونین کونسلوں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ نکاح رجسٹراروں کے رجسٹر خالی نظر آئیں گے۔ بہت سی ایجنسیوں کو اس سے مستثنیٰ کرنا پڑا۔ بعض شہری علاقوں کے علاوہ (جہاں کرایہ دار نکاح خوان مل جاتے ہیں یا فرضی طور پہ فارم پر کر لئے جاتے ہیں۔) عوام نے قطعاً اس کا بائیکاٹ کیا۔ حتیٰ کہ بعض مقامات پر لوگوں نے ایسے رشتہ داروں کے نکاحوں میں شرکت کرنا بھی چھوڑ دیا جس میں نکاح فارم پر کئے جاتے ہیں۔ اس کے لئے تحریری معاہدے کئے اور شائع کر دئے گئے۔ ابتداء میں جب صدر ایوب کی جابرانہ مارشل لاء میں حکام نے سختی سے کام لیا تو علماء اور عوام نے ان خلاف اسلام قوانین پر عمل کرنے کی بجائے جیل میں جانے مقدمات میں پھنس جانے جرمانے ادا کرنے کو ترجیح دی مگر احکام اسلام سے بغاوت نہیں کی۔ (ملاحظہ ہو ڈیرہ اسماعیل خان اور پشاور کی عدالتی کارروائیاں از ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۷ء)

یہاں پر یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ ۱۹۵۶ء سے ۱۹۷۰ء تک ان قوانین کے خلاف مسلسل اور مفصل لکھا جاتا رہا۔ مگر کسی معتمد آزاد عالم دین یا کسی آزاد دینی ادارہ سے اس کی کوئی مخالفت نہیں ہوئی۔ کوئی آواز اٹھی بھی تو صرف سرکاری ادارہ سے اور صدر کی مشاورتی کونسل کے بعض ان افراد کی جانب سے جن کا سلسلہ سند عموماً مستشرقین یا مغرب زدہ حضرات سے جا ملتا ہے اور بس۔

بہر حال عائلی قوانین کے خلاف عوام کے دینی جذبات کا یہ سرسری اور نا تمام جائزہ ہے نہ معلوم عوامی حکومت کے دعویدار حضرات عوام کے ان ٹھکرائے ہوئے قوانین کے تحفظ کا آخر کس طرح ارادہ کر رہے ہیں۔ جو قوانین عوام کے نمائندوں کے سامنے تک نہ آسکے اور مارشل لاء کے ڈنڈا سے نافذ کئے گئے۔ عوامی حکومت کو کس طرح بھی زیبا نہیں کہ ان کے نام سے بھی اپنی زبان کو گندہ کریں۔

قرآن وسنت سے ان قوانین کا کھلا تصادم

اسی بیان میں آنجناب نے اس نیک عزم کا اظہار کیا ہے کہ پیپلز پارٹی قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنائی گئی۔ اسے عوام کے دینی جذبات کا احترام کہئے یا اپنے ہی اسلام کا تقاضا بہرصورت ارادہ نیک ہے اس کے ساتھ لازماً آپ کا اور آپ کی پارٹی کا یہ بھی ارادہ ہوگا کہ سابقہ قوانین بھی جو قرآن وسنت کے منافی ہیں ان کو بدل دیا جائے گا۔ کیونکہ جن عوام کا یا جس مسلمان کے اسلام کا تقاضا یہی ہے کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہ بنایا جائے انہیں عوام اور ان کے اسلام کا یہ بھی شدید تقاضا ہے۔ کہ قرآن وسنت کے منافی موجودہ قوانین کو بھی جلد از جلد ختم کر دیا جائے۔ گذشتہ جائزہ میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ملک کے ہر طبقہ اور ہر مسلک کے قرآن وسنت کو سمجھنے والے افراد نے ان قوانین کو قرآن وسنت کے منافی ہی سمجھا ہے۔ اس لئے اس پر اب مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ——— ۔

تاہم آپ کے بیان سے چونکہ اس فتنہ کو از سر نو تحفظ مل جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے بطور نمونہ صرف آپ کے استحضار کے لئے ان قوانین کے دو تین دفعات کا قرآن وسنت سے کھلا تصادم بیان کر دینا بے محل نہیں ہوگا۔ اس پر باقی دفعات کو قیاس کیا جائے۔ چنانچہ عرض ہے کہ :

۱۔ عائلی قوانین میں مطلقہ کی عدت نوے ۹۰ دن مقرر کی گئی ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی صریح نص میں ثلثہ قروء (یعنی تین دفعہ ایام ماہواری) کا لفظ موجود ہے۔ ثلثہ قروء کے معنی نوے ۹۰ دن یا تین ماہ کسی لغت میں نہیں سے گئے۔ اور اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں بھی کسی مسلمان نے یہ معنی نہیں کئے۔ یہ جرأت صرف عائلی قوانین کے مصنفین کو ہوئی ——— اور اس کے باعث جو خرابیاں پیش ہوں گی وہ معمولی نہیں بلکہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینا پڑے گا۔ مثلاً جس عورت کو طلاق کے بعد تین دفعہ ماہواری تو نہیں آئی، مگر نوے ۹۰ دن اسکی طلاق کو گزر گئے ہیں۔ اب قرآن کریم کی رو سے اس کا دوسری جگہ نکاح کرنا حرام ہوگا اور اگر کریگی تو منعقد نہیں ہوگا اور اس نئے خاوند سے اس کا نفع اٹھانا زنا ہوگا۔ لیکن عائلی قوانین کی رو سے یہ سب کچھ جائز اور حلال ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس اس کے برعکس بھی کئی صورتیں نکلیں گی۔ ظاہر ہے کہ یہ قرآن پاک کا کھلا مقابلہ ہے۔ جس کی عائلی قوانین کے مصنفین کے سوا کوئی مسلمان بھی جرأت نہیں کر سکتا۔

ایک دوسری دفعہ : نابالغہ کا نکاح عائلی قوانین میں جرم ہے۔ نکاح کو ثابت نہیں سمجھا جائیگا۔ جبکہ قرآن کریم کی صریح نص والائی لم یحضن میں بتلایا گیا ہے کہ جس عورت کو ابھی تک ماہواری نہیں

آئی اسکی عدت تین ماہ ہے۔ ظاہر ہے کہ عدت طلاق کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اور طلاق فرع ہے نکاح کی اب اگر صغیرہ کا نکاح ہی نہیں ہوتا تو اس پر طلاق کیسی - ؟ اور جب اس پر طلاق واقع نہیں ہوئی تو اسکی عدت کیسی ـــــ

علاوہ ازیں صحاح ستہ میں حدیث پاک کی پانچ معتبر کتابوں نے صدیقہ عائشہ رض کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صغر سنی میں نکاح کی تصریح موجود ہے۔ اگر حدیث کی ان معتمد ترین کتابوں میں سے پانچ کتابوں کی روایت غیر معتبر ہو جاتی ہے تو پھر کتب اسلام کی وقعت ہی کیا باقی رہ جاتی ہے - اور اس طرح تو پھر سارا دین ہی ناقابل اعتبار ہو جاتا ہے۔ والعیاذ باللہ۔

دراصل کم سن بچیوں کے نکاح کے خلاف دشمنان اسلام نے اس لئے غوغا آرائی کرنے پر زور دیا ہے کہ کسی نہ کسی طرح خود مسلمانوں کے ہی قلم اور زبان سے سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل کو معاذ اللہ بالواسطہ سہی نامناسب اور ناجائز کہلوایا جائے۔ اور افسوس صد افسوس کہ عیار دشمن اس میں کامیاب ہو گیا۔ مسلمان نے اسطرح کے نکاح کو قابل جرم کہا اور یہ نہ سوچا کہ اس کی زد کہاں جا پڑی ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون -

۳- ایک اور دفعہ : قرآن وسنت نے نکاح منعقد ہونے کے لئے دو مسلمان گواہوں کے سامنے زوجین کے ایجاب وقبول کو کافی ٹھہرایا ہے۔ جس پر امت کے ہر طبقہ کا اجماع موجود ہے۔ مگر عائلی قوانین نے اس میں ایک اور شرط بڑھا کر الزائد علی کتاب اللہ - پر وارد شدہ لعنت کا اپنے آپ کو مستحق ٹھہرایا ہے یعنی یہ کہ جب تک اس کا رجسٹریشن نہیں کیا جاوے گا۔ نکاح ثابت نہیں ہوگا۔ زوجین کے ایجاب وقبول پر دو عادل گواہ موجود ہیں۔ مگر نکاح کو اس لئے ثابت نہیں سمجھا جاتا کہ اس کا رجسٹریشن نہیں کیا گیا۔ زید کی عورت کو جس کا نکاح دو عادل گواہوں سے ثابت ہے عائلی قوانین نے عمرو کے ساتھ اس لئے نکاح کرنے کی اجازت دے دی ہے کہ وہ نکاح رجسٹرار کے ہاں درج نہیں ہے شریعت محمدیہ علی صاحب الصلوٰۃ والتحیہ کے حکم میں ایسی عورت کے ساتھ عمرو کا نکاح قطعاً حرام اور عمرو کی ایسی عورت کے ساتھ قربت یقینی زنا متصور ہوگی مگر عائلی قوانین نے اس حرام زنا کو حلال قرار دیدیا۔ ـــــ اور طرفہ تماشا یہ کہ قرآن وسنت کے منافی کوئی قانون نہیں بنایا جاوے گا، کا اعلان کرنے والے اس قانون کو تحفظ بھی دے رہے ہیں، فیا للعجب۔ اس طرح تعدد ازواج پوتے کی میراث وغیرہ دفعات کا حال ہے۔ فرض کریں ایوب خان کیطرح نشۂ اقتدار میں کسی کو اس پر اصرار ہے کہ قرآن وسنت کے یہ قوانین منافی نہیں ہیں۔ اور قرآن وسنت کے یہ معنی نہیں ہیں جو علماء اسلام سمجھ رہے ہیں۔ اور ہم ہمہ بے خبری از اسلام

کے باوجود چونکہ تعلیم یافتہ میں علماء اسلام کے مقابلہ میں قرآن و سنت کو زیادہ سمجھتے ہیں تو بھی اتنی بات تو واضح ہے کہ ملک میں رہنے والے اہل سنت والجماعت کے تمام طبقے دیوبندی بریلوی اہل حدیث نیز اہل تشیع ان قوانین کو اپنے اپنے مذہب کے خلاف سمجھ رہے ہیں۔ جیسا کہ حوالہ جات بالا سے ثابت ہو رہا ہے تو جس طرح ان قوانین سے ہندو، سکھ، عیسائیوں اور پارسیوں کو ان کے مذہبی عائلی قوانین کے احترام میں مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ چاہے ان قوانین کے مصنفین کے نزدیک ان کے عورتوں پر ظلم بھی ہو رہا ہے تو اہل سنت کے تمام طبقات اور اہل تشیع کو بھی ان قوانین سے مستثنیٰ کر دیا جائے کیا ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ مذاہب کا احترام تو ضروری ہے۔ لیکن پاکستان میں کروڑوں اہل سنت اور اہل تشیع کے مذہب کا احترام ضروری نہیں ہے۔

آپ کہیں گے کہ اگر ان سب کو بھی مستثنیٰ کر دیا جائے تو پھر یہ قوانین چلائے کس پر جاویں گے تو اصولی جواب تو یہی ہے۔ کہ آخر شعر گفتن چہ ضرورت۔ اگر پاکستان میں رہنے والا کوئی مذہب اس کو قبول نہیں کرتا تو جلا دیں ان کو آگ کی بھٹی میں دے ماریں۔ صدر ایوب کے منہ پر لیکن اگر یہاں کی ہر حکومت ان کو باقی رکھنے اور نافذ کرنے کی قسم ہی کھا بیٹھی ہے تو پھر جب تک پاکستان میں ارتداد کی کھلی چھٹی ہے ایک سول میرج ایکٹ قسم کا قانون رکھیئے کہ پاکستان کا جو باشندہ حنفی اہل حدیث دیوبندی بریلوی مودودیئے اور اہل تشیع ہونے سے بیزاری کا فارم بھرے گا۔ یہ قوانین اس پر چالو ہوں گے۔ اس طرح حکومت کی قسم بھی پوری ہو جائے گی۔ اور پابند مذہب لوگوں کا اشتعال بھی ختم ہو جاوے گا۔ ——

■■

دیانتداری اور خدمت ہمارا شعار ہے

ہم اپنے ہزاروں کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے

پستول مارکہ آٹا

پسند فرما کر ہماری حوصلہ افزائی کی ہے۔

ہمیشہ پستول مارکہ آٹا استعمال کیجئے جسے آپ بہتر پائیں گے۔

★

نوشہرہ فلور ملز جی، ٹی روڈ۔ نوشہرہ۔ فون ۱۲۶

روحِ انتخاب

اسلام کا "سوشلزم" ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ اسلامی تعلیم

"اقبال کا سوشلزم، حضرت ابوذرؓ کا سوشلزم یا اسلام کا سوشلزم اب اسلامی تعلیم کی راہ سے ہی آ سکتا ہے۔ اگر ہم وہ سوشلزم لانا چاہتے ہیں جو اقبال کے الفاظ میں "حرفِ قُلِ العفو" میں پوشیدہ ہے تو ہمیں ایک لمحہ کے لئے اس بات پر بھی غور کرنا چاہئے کہ جو شخص اپنا سارا فالتو مال خدا کی راہ میں دینے کیلئے تیار ہو جاتا ہے۔ اور اپنے کل کی فکر نہیں کرتا، خدا کی رزاقیت اور ربوبیت پر اُس کے ایمان کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ خدا کے بالمقابل اُسے اپنی جان اور دنیا سے کتنی محبت ہوتی ہے۔ آخرت کی زندگی اور خدا کی باز پرس اُسے کس قسم کی حقیقت نظر آتی ہے۔ افلاس کے خوف سے اس کی آزادی اور بے پروائی کا رنگ کیا ہوتا ہے۔ خدا پر اس کے توکل کا مقام کیا ہوتا ہے۔ خدا کی اس گارنٹی پر کہ اس نے ہر جاندار کا رزق اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ اس کا یقین کس قسم کا ہوتا ہے۔ کیا ہم میں سے ایک بھی ایسا ہے جو اس قسم کے ایمان اور توکل کا دعویٰ کر سکے۔ ؟ ایک طرف ہم بنکوں میں پڑے ہوئے ذہب اور فضہّ کے بڑے بڑے ڈھیروں کی حفاظت جان سے بھی زیادہ کرتے ہیں۔ کہ ان میں ایک ذرّہ بھی ہل نہ جائے، اور دوسری طرف اسلامی سوشلزم اور حضرت ابوذرؓ کے سوشلزم کی تمنا کرتے ہیں۔ اور جب پوچھا جائے تو ہمارا جواب بالعموم یہ ہوتا ہے کہ جس وقت سب لوگ اپنے اپنے اندوختوں کو ترک کریں گے۔ ہم بھی اپنا اندوختہ ترک کریں گے۔ کیا حضرت ابوذر غفاریؓ کا جواب یہی ہو سکتا تھا جن کو اپنی موت کے وقت اس بات کا افسوس تھا کہ ان کے گھر میں لکڑی کا پیالہ کیوں موجود ہے۔ اور وہ اپنے خدا کے پاس ایسی حالت میں کیوں نہیں جا رہے کہ ان کے پاس کچھ بھی موجود نہ ہوتا۔ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ اقبال اور حضرت ابوذرؓ کا سوشلزم نافذ کرنے سے پہلے اسلامی تعلیم کی ضرورت ہے۔ جو ہمارے دلوں میں خدا اور رسولؐ اور آخرت پر ابوذرؓ کا ایمان پیدا کر سکے"

ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

(حکمتِ اقبال صفحہ ۴۰۸ - ۴۰۹)

(بشکریہ۔ اسلامی تعلیم - لاہور)

ایک نئ دنیا کی دریافت

از مولانا محمد علی جوہر مرحوم ۔۔۔ ڈائری نویس مولانا عبدالماجد دریابادی

آسٹریلیا یا افریقہ کے کسی وحشی کو جس نے اپنے وحشت زار سے زائد کچھ بھی نہ دیکھا ہوا ذرا ایک بیک پکڑ کر کسی جہاز پر تو سوار کرا دیجئے اور وہ جہاز رُکے آکر ساحل امریکہ پر جو آج دنیائے قدیم کے ہر متمدن سے متمدن خطہ سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس وحشی کے لئے اس براعظم کا انکشاف کیا آج بھی ویسا ہی حیرت انگیز نہ ہوگا، جیسا کولمبس نے چار سو برس قبل کیا تھا۔؟ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر اس لئے کہ کولمبس کو تو خالی خولی ایک براعظم ہی ملا تھا۔ اور اس وحشی سیاح کو اس کے ساتھ ساتھ ایک پورا تمدن بھی ملے گا۔ اسکی مسرت اور اسکی حیرت کا کیا کہنا۔۔؟ بس یہی حال میرا بھی (قرآن پڑھ کر) مجھے بھی بیک وقت دوہری دوہری دولتیں نصیب ہوئیں۔ اللہ کو اور اللہ کے کلام کو تو سمجھا ہی۔ ساتھ ساتھ اپنی حقیقت بھی سمجھ میں آگئی۔ (ISLAM THE KINGDOM OF GOD ص۔ ۶۵)

لوگ کہتے ہیں کہ خود شناسی سے خدا شناسی تک پہنچو، یہاں الٹی خدا شناسی ہی خود شناسی کا بھی ذریعہ بن گئی۔ "من عرف نفسہ عرف ربہ" (جس نے اپنے کو پہچانا اپنے رب کو بھی پہچان لیا۔) مدت سے سنتے چلے آئے تھے۔ آج محمد علی کی زبان سے "من عرف ربہٗ عرف نفسہ" (جس نے اپنے رب کو پہچانا، اپنے آپ کو بھی پہچان لیا۔) بھی سن لیا۔

نومسلم کے جوشِ تبلیغ کا اندازہ اسی نومسلم کی زبان سے کیجئے۔

"میں اپنی اس نئی دنیا کی دریافت کو کیا اپنے ہی تک سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔؟ نہیں، کہاں ممکن تھا۔؟ دوسرے معاملات میں میں کیسا ہی خودغرض سہی، اس حقیقت کبریٰ کا، اس حقیقت الحقائق کا انکشاف جس گھڑی میرے روبرو ہوا، میرا سارا وجود اس سے پُر ہوگیا، میں اسے چھپانا چاہتا بھی تو میرے سینے کے اندر اس کا چھپا رہنا کیونکر ممکن تھا۔؟ میری روح کا تو ریشہ ریشہ اس انکشاف سے پھٹنے لگا، اور جی بے اختیار بیقرار ہو ہو کر یہ چاہتا تھا کہ چیخ چیخ کر اور پکار پکار کر سب کو اس کی دعوت دینی شروع کر دوں ـــــ گھر کے بوڑھوں بچوں کو، نوکروں، چاکروں، کتے، بلی، جانوروں کو، بیجان درختوں اور جھاڑیوں کو، سب کو یہی پیغام، یہی بشارت (دیوانہ وار) پہنچانا شروع کر دوں۔" (صـ ۹۶)

قارئین

افکار و تاثرات

مولانا مدنیؒ کے اندیشے | حضرت شیخ مدنیؒ کے اندیشے پڑھ لئے، بلکہ سنا دیئے اور بہ تکرار۔ پروفیسر سلیم صاحب کا خط پڑھ کر میں نے بہت ضروری سمجھا تھا کہ پاکستان سے متعلق حضرت کی رائے بھی اس مضمون کا جزو ہونا چاہیئے۔ نہ صرف خیال بلکہ اس پر قلم بھی اٹھایا۔ کیا "حضرت مدنیؒ پاکستان کے خلاف تھے" کے عنوان سے چند سطریں بھی لکھیں۔ خطبہ جو پنڈی مل گیا تھا۔ خطبہ سہارنپور اور کشف حقیقت کو کتب خانہ میں تلاش کر رہا تھا کہ تائید غیبی کے طور پر الحق مل گیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرما دے۔ بے حد خوشی ہوئی کہ جو کچھ سمجھانے میں میں دقت محسوس کرتا، قلم ساتھ نہ دیتا اور نقص تحریر کا گلہ باقی رہتا۔ وہ ساری کمی آپ نے پوری کر دی ــــ لیکن جیسا کہ ترجمان الاسلام نے اُسے پمفلٹ کی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ (یعنی پروفیسر صاحب کے مضمون کو) ضروری ہے کہ یہ مضمون بھی اس کے ساتھ ہی قارئین تک پہنچے۔ نئی نسل پاکستانی پیداوار کو اس کا کوئی بھی علم نہیں کہ آخر حضرتؒ کا قصور ہی کیا تھا جس کی وجہ سے پروفیسر صاحب جیسے بزرگ بھی رو میں بہہ کر آپ کے خلاف گستاخانہ تحریر تک پہنچ گئے۔

مدیر ترجمان کو میں لکھوں گا کہ وہ اسے مضمون اعتراف تقصیر کا جزو بنائیں ــــ البتہ ایک چیز اگرچہ آپ کی تحریر میں صاف کر دی گئی ہے کہ ان اندیشوں سے بچنے کا واحد علاج تقسیم ملک کے فوراً بعد بھی اور اب بھی یہی ہے کہ یہاں مکمل اسلامی نظام قائم کر دیا جاتا۔ اور اب بھی یہاں مکمل اسلام کو نافذ کر دیا جاوے تو یہ خطرات سب ختم ہو سکتے ہیں۔ اور جو پیش آگئے ہیں۔ ان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ بہرحال آپ کے مضمون میں یہ بات آگئی ہے۔ لیکن اس کو خاص طور پر نمایاں کرنا تھا، اور اب بھی ممکن ہو تو اسے مضمون کا ضمیمہ بنایا جاوے۔ اور اگر آپ کا یہ مضمون اعتراف تقصیر کا جزو بن جاتا ہے تو اس میں بھی آجانا چاہیئے۔ تاکہ مولانا عبدالستار نیازی جیسے بزرگوں کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ "سقوط ڈھاکہ کے بعد آج ملک میں یہ نعرے بلند ہو رہے ہیں کہ ابوالکلامؒ اور حسین احمدؒ کا نظریہ صحیح تھا۔ اس قسم کا نعرہ لگانے والوں سے ہمیں ہوشیار رہنا پڑے گا ــــ یہ لوگ "اندیشے" قسم کے

مولانا قاری فیوض الرحمان ایم اے۔ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد

حضرت مولانا سید احمد صاحب

۱۸۸۰ ـــــــــ ۱۹۵۰ء

پیدائش | آپ ۱۸۸۰ء میں تحصیل ایبٹ آباد کے ایک قصبہ "رجوعیہ" میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مولانا میر احمد صاحبؒ رجوعیہ کی ایک مسجد محلہ "اسماعیل خیل" کے امام تھے۔

ابتدائی تعلیم | آپ کے والد نے اپنی بیماری میں آپ کو نصیحت کی کہ علم حاصل کرنے کے لیے چلے جاؤ۔ چنانچہ اپنے والد کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے آپ نے اس زمانہ کے رواج کے مطابق مختلف علماء سے علم دین حاصل کیا۔ آپ نے ہزارہ کے جن اساتذہ سے تعلیم حاصل کی تھی ان میں موضع "ڈھینڈہ" تحصیل ہری پور کے مولانا محمد معصومؒ بھی تھے۔ مولانا موصوف حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ بانی جامعہ اشرفیہ لاہور کے بھی استاذ تھے۔ تذکرہ حسن میں انہوں نے مولانا محمد معصوم صاحبؒ کا ذکر کیا ہے۔

مولانا محمد معصوم صاحبؒ سے آپ نے منطق اور فلسفہ کی کچھ کتابیں پڑھی تھیں۔ اس کے بعد آپ ہندوستان چلے گئے۔ اور وہاں مختلف مدارس میں تعلیم حاصل کرتے رہے۔

مدرسہ مطلع العلوم کا قیام | مولانا سید احمد اور مولانا خلیل احمد دونوں نے مل کر ایک مدرسہ "مطلع العلوم" قائم کیا ریاست رامپور کے عربی مدارس میں مدرسہ عالیہ کے بعد اسی کا نمبر تھا۔ (اور اب بھی موجود ہے) مولانا خلیل احمد اس مدرسہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث تھے اور مولانا سید احمد اس مدرسہ کے نائب مہتمم اور صدر مدرس تھے۔ مولانا خلیل احمد کی وفات کے بعد آپ ہی اس مدرسہ کے مہتمم بھی رہے اور شیخ الحدیث بھی۔

آبائی وطن سے لگاؤ | آپ کو اپنے آبائی وطن "رجوعیہ" سے اتنا لگاؤ تھا کہ آپ ہمیشہ ماہ رمضان رجوعیہ میں آکر گذارتے تھے۔ اسی عرصۂ قیام کے دوران "بانڈی عطائی خان" میں مولانا محمد حلیم صاحب کے مدرسہ کے ممتحن ہونے کا فریضہ بھی انجام دیتے تھے۔ ایک دفعہ آپ حضرت مولانا خلیل الرحمٰن صاحب

مدظلہ العالی[۱] کی دعوت پر مدرسہ "رحمانیہ" ہری پور کے مہتمم بن کر بھی تشریف لائے تھے۔

جودوسخا | آپ کی طبیعت میں فیاضی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب رجوعیہ آتے تو اپنے محلہ کے تمام غریب لوگوں کی امداد کرتے۔ مسجد میں کوئی مسافر آتا تو اس کے لئے خود اپنے گھر سے کھانا پکوا کر لاتے۔ آپ رحمدلی اور تقویٰ میں ایک بے نظیر انسان تھے۔

سب سے کم تنخواہ | مدرسہ مطلع العلوم کے مہتمم اور شیخ الحدیث ---- کام سب سے زیادہ۔ لیکن تنخواہ سب سے کم لیتے تھے۔ بس گذارا الاؤنس ہی سمجھئے۔

مطلع العلوم سے لگاؤ | آپ تقسیم ملک سے کچھ پہلے رامپور سے رجوعیہ تشریف لے آئے تھے۔ آپ کو مدرسہ مطلع العلوم سے ایسا لگاؤ تھا کہ ۱۹۴۷ء کے فسادات کے دوران بھی اپنے آپکو خطروں میں ڈال کر رجوعیہ سے ریاست رامپور جانے کا عزم کرلیا۔ اور بالاخر بمبئی، بڑودہ، ناگپور وغیرہ کے راستے رامپور پہنچے۔

واپسی اور انتقال | ۱۹۴۹ء میں آپ رامپور سے رجوعیہ تشریف لائے اور جون ۱۹۵۰ء میں اس دار فانی سے ہمیشہ کے لئے رحلت فرما گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

اولاد | آپ کی دو صاحبزادیاں تھیں، جن میں سے بڑی قاضی عبدالقادر مرحوم ایڈوکیٹ ایبٹ آباد کے نکاح میں تھیں۔ دونوں میاں بیوی وفات پا چکے ہیں۔ ان کے چار بیٹے بقید حیات ہیں جو راولپنڈی میں مقیم ہیں۔

دوسری صاحبزادی زندہ ہیں اور مولانا عبدالشکور صاحب ایم اے (گولڈ میڈلسٹ) فاضل دیوبند کی اہلیہ ہیں۔ ان سے چھوٹے امجد حسن ہیں۔ یہ مدرسہ عالیہ رامپور کے فارغ التحصیل بھی ہیں اور الہ آباد یونیورسٹی کے "فاضل ادب" بھی۔ پنجاب یونیورسٹی سے مولوی فاضل کے امتحان میں بھی اوّل آئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں ۱۹۵۵ء تا ۱۹۵۹ء شعبۂ فارسی و عربی کے ناظم بھی رہ چکے ہیں ---- ۱۹۶۰ء میں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے مصر گئے تھے۔ اب بھی وہیں ہیں۔ اور قاہرہ یونیورسٹی میں اردو زبان کے لیکچرر ہیں۔

---

[۱] آجکل مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مدرسہ احمد المدارس سکندرپور، ہری پور میں شیخ الحدیث ہیں۔ شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق صاحب (اکوڑہ خٹک) دامت برکاتہم کے دیوبند کے ساتھی ہیں۔ پرانے بزرگوں کی یادگار ہیں۔ نہایت ہی معمولی وظیفہ پر اس مدرسہ کی رونق کو چار چاند لگائے ہوئے ہیں۔ اللہ قبول فرمائے۔ (س)

جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی

مولانا حسین احمد مدنیؒ کے بارہ میں اپنے گستاخانہ رویہ پر اشکِ ندامت

شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ کے سیاسی موقف سے اختلاف نہ پہلے گناہ تھا نہ اب ہے، بشرطیکہ یہ خلوص پر مبنی رہا ہو۔ مگر جہاں تک اپنے دور کے اس ولی کامل مجسمۂ اخلاص سراپا جہاد و عبدیت شیخ وقت کا تعلق ہے، ان کی شان میں توہین آمیز رویہ اور گستاخانہ جسارتوں کا ارتکاب ایک ایسا گناہ ہے جو علیٰ رؤس الاشہاد اور ببانگ دہل اظہارِ ندامت اور توبہ و اعترافِ قصور ہی سے شاید معاف ہو سکے، محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب صاحبِ دل اور صاحب قلم بزرگ ہیں، مسلم لیگ کے قافلہ سالاروں اور تحریک پاکستان کے اولین منادوں میں رہے مگر اللہ نے انکو خاص کرم سے نواز کر توفیق دی کہ وہ شیخ الاسلامؒ کی شان میں اپنے سابقہ گستاخانہ رویہ پر اشکِ ندامت بہائیں اور امت کے سامنے برملا اعترافِ تقصیر کر سکیں، یہاں ان کے مضمون کے کچھ حصے پیش ہیں۔ (سمیع الحق)

اس تحریر سے دو مقاصد میرے پیشِ نظر ہیں۔ پہلا مقصد تو یہ ہے کہ گزشتہ زندگی (۱۹۳۷ء تا ۱۹۵۷ء) میں مجھ سے جس قدر گستاخیاں حضرت اقدس مجاہدِ اعظم شیخ الاسلام آیۃٌ من آیات اللہ الصمد سیدی وشیخی وسندی الحاج الحافظ المولوی سید حسین احمد مدنی قدس سرہٗ العزیز کی شان رفیع البیان میں سرزد ہوئی ہیں، اُن پر اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے سامنے غیر مشروط انداز میں اظہارِ ندامت اور اعترافِ تقصیر اور اقرارِ جرم کروں اور بارگاہ ایزدی میں صدقِ دل سے استغفار کروں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ ایک اہم تاریخی واقعہ کی وضاحت کر دوں اور حقائق کو ان کی اصل شکل میں پیش کر دوں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جنوری ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر اقبال مرحوم نے

محض اخباری اطلاع کی بناء پر تین اشعار سپردِ قلم کئے تھے، جن کی وجہ سے علمی اور دینی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا تھا۔ جناب طالوت نے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول و منعطف کرائی کہ حضرت اقدسؒ نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ وطن کو اساسِ ملت بنالو، اس لئے دیانت و عدالت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ اعلان کردیں کہ اب مجھے حضرت مولانا حسین احمدؒ صاحب پر اعتراض کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ تو ڈاکٹر صاحب مرحوم کا یہ اعلان روزنامہ "احسان" لاہور میں ۲۰ مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہوگیا تھا۔ لیکن قوم کی بدقسمتی سے ۲۱ اپریل کو ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہوگیا جبکہ ان کا آخری مجموعہ کلام موسوم بہ ارمغانِ حجاز نومبر ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا۔ اگر یہ مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان تین اشعار کو حذف کر دیتے یا حاشیے میں اس حقیقتِ حال کو واضح کر دیتے کہ میں نے یہ اشعار غلط اخباری اطلاع کی بناء پر لکھے تھے۔ بعد ازاں حضرت مولاناؒ نے اخباری رپورٹ کی تردید کردی، اس لئے ان اشعار کو کالعدم یا مستردِ سمجھنا چاہیئے۔ لیکن افسوس کہ یہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا اس لئے نہ ان اشعار کو حذف کیا گیا اور نہ حاشیے میں حقیقتِ حال کو واضح کیا گیا۔

نتیجہ اس غفلت اور کوتاہی کا یہ نکلا کہ گزشتہ تیس سال سے مسلمانانِ عالم بالعموم اور مسلمانانِ پاکستان بالخصوص ان اشعار کی بناء پر حضرت اقدسؒ سے بدگمان ہوتے چلے آرہے ہیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنی غلطی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ ملتِ اسلامیہ کے نوجوانوں کی اصلاحِ خیال کا فریضہ بھی انجام دے دوں تاکہ وہ سوءِ ظن کے گناہ سے محفوظ ہوجائیں۔ میں ان اشعار کو تو خارج نہیں کرسکتا مگر مسلمانوں کو یہ تو بتا سکتا ہوں کہ حضرت اقدسؒ نے اپنی تقریر میں نہ تو یہ فرمایا تھا کہ ملت کی بنیاد وطن ہے اور نہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ تم وطن کو اپنی ملت کی بنیاد بنالو۔ یہ اشعار بلاتحقیق حال سپردِ قلم ہوگئے تھے چنانچہ جب ڈاکٹر صاحب پر حقیقت منکشف ہوئی تو انہوں نے اپنے الفاظ واپس لے لئے تھے بالفاظ دیگر ان اشعار کو قلمزد کر دیا تھا۔

اب میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت اور استقامت طلب کرتا ہوں کہ وہ مجھے اظہار حق کی توفیق عطا فرمائے اور میری توبہ کو قبول فرمائے اور اس تحریر کو عامۃ المسلمین کے لئے نافع بنائے۔ آمین یارب العالمین۔

یہ بات مسلمانوں کی قومی خصوصیات میں سے ہے کہ وہ اختلاف رائے کو برداشت نہیں کرسکتے۔ اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوجائے گا کہ میری یہ تنقید تلخ تو ہے مگر غلط نہیں ہے جن لوگوں نے سلاطین وقت سے اختلاف کیا تو انہوں نے طاقت کے نشے میں مست ہوکر یا قتل کردیا یا محبوس

کردیا اور جن افراد نے علماء سے اختلاف کیا انہوں نے اپنے مخالفین کو دائرہ اسلام سے خارج کردیا۔ (آگے اسکی چند مثالیں درج کرنے کے بعد) دوسری صدی ہجری سے لیکر عصرِ حاضر تک کسی زمانے میں بھی اختلاف رائے کو برداشت نہیں کیا۔ یہ متعصبانہ روش اور یہ تنگ نظری صرف عقائد تک محدود رہتی تو بھی اک بات تھی۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ یہ بیماری سیاست کی دنیا میں بھی داخل ہوگئی۔ جن لوگوں نے ۱۹۳۲ء سے ۱۹۴۷ء تک کا پرآشوب دور دیکھا ہے۔ ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ حامیانِ مسلم لیگ اُن تمام مسلمانوں کے اسلام کو شک اور شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے جو ان سے دلائلِ واضحہ اور براہین نیرّہ کی بنا پر اختلاف کرتے تھے۔ نیز بلا استثنا ان تمام مسلمانوں کو غدّار قوم، ضمیر فروش اور ہندوؤں کے زرخرید کہا کرتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی۔ (جب ہوش رخصت ہوجاتا ہے اور صرف جوش کارفرما ہوتا ہے تو ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔) کہ مسلم لیگ کو کفر و اسلام کا معیار بنا لیا گیا تھا چنانچہ ہر شخص ببانگ دہل یہ اعلان کیا کرتا تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" حالانکہ کفر و اسلام کا معیار کسی سیاسی جماعت میں شرکت نہیں ہے۔ بلکہ اتباع شریعت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیم ہے اور طرفہ تماشا یہ ہے جس پر آج میری عقل بھی حیران ہے کہ مسلم لیگ تو وہ جماعت تھی جس میں داخلے کے لئے نہ مسلمانوں کی سی صورت شرط تھی نہ ان کی سی سیرت، نہ نماز روزے کی پابندی شرط تھی نہ دین سے واقفیت۔ اہلِ قرآن اور اہلِ حدیث، اہلِ فقہ اور اہلِ تصوف، بریلوی اور دیوبندی، سُنّی اور شیعہ، احمدی اور کمیونسٹ سب اس کے رکن بن سکتے تھے اور ۱۹۳۱ء میں اس کا صدر وہ شخص تھا جس کے ہم خیالوں کو اسلام سے خارج قرار دینے کے لئے ۱۹۵۳ء میں کراچی سے لاہور تک زبردست ہنگامہ برپا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ اس زمانے میں ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جو مسلمان مسلم لیگ میں شامل نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیرخواہ نہیں ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بڑا عالم دین کیوں نہ ہو۔ یہ تصوّر کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ ہندوؤں کا غلام ہے، ضمیر فروش ہے، غدّار قوم ہے، عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے، خواص کے دماغوں پر بھی مسلّط ہو چکا تھا۔ چنانچہ وہی مولانا ظفر علی خاں جنہوں نے حضرت اقدس مولانا مدنیؒ کی شان میں یہ شعر کہا تھا۔

گرمیٔ ہنگامہ تیری آج حسین احمد سے ہے ۔۔۔ جس سے ہے پرچم روایات سلف کا سربلند

جب مسلم لیگ میں شامل ہوئے تو ان کی ذہنی پستی کا یہ عالم ہوگیا کہ انہوں نے اسی حسین احمد سے یوں خطاب کیا اور ایک لمحے کے لئے بھی یہ نہ سوچا کہ میں کس عظیم المرتبت ہستی کو مخاطب بنا رہا ہوں ؎

حسین احمد سے کہتے ہیں مدینے کے خزف ریزے ۔۔۔ کہ لٹّو ہوگئے کیا آپ بھی سنگم کے موتی پر

اس شعر سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ سیاسی اختلاف کی وجہ سے شیخ الاسلام مجاہد اعظم حضرۃ

مولانا حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ العزیز کا علمی اخلاقی اور روحانی مقام خان مرحوم کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تھا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ جن لوگوں نے لیگ سے اختلاف کیا تھا۔ خصوصاً ارکان جمعیۃ العلماء ہند، ان کی نیّت نیک تھی، وہ ہرگز ضمیر فروش یا غدّارِ قوم یا ہندوؤں کے زرخرید نہیں تھے، چنانچہ عزت مآب صدر مملکت پاکستان بالقابہ[1] نے بھی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "FRIENDS NOT MASTERS" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ صفحہ ۲۰۰ پر لکھتے ہیں: "سب لوگ جانتے ہیں کہ بہت سے علماء نے قائد اعظم سے علی الاعلان اختلاف کیا تھا اور پاکستان کے تصوّر کی تردید کی تھی، لیکن میرے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جن علماء نے تشکیل پاکستان کی مخالفت کی تھی وہ سب ضمیر فروش تھے۔ ان میں قابل اور مخلص لوگ بھی تھے۔ ہاں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ پاکستان کی تشکیل سے ان کا اقتدار ختم ہو جائے گا"[2]

فی الجملہ حقیقت یہی ہے کہ جمعیۃ العلماء کے ارکان نہ قوم کے بدخواہ تھے نہ ضمیر فروش بلکہ وہ علی وجہ البصیرت یہ سمجھتے تھے کہ نہ تو تقسیم ہند سے ہندی مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو سکے گا۔ کیونکہ ان کی بہت بڑی آبادی ہندوستان میں ہندوؤں کے رحم و کرم پر رہ جائے گی۔ اور وہ انہیں اپنے انتقام کا نشانہ بنائیں گے اور نہ پاکستان میں اسلامی حکومت قائم ہو سکے گی، کیونکہ لیگ کے ارباب حل و عقد کی غالب اکثریت نہ دین سے واقف ہے اور نہ اس کی زندگی اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ لیکن حامیانِ لیگ نے مخالفت کے جوش میں اسلامی تہذیب اور علماء دین کے احترام دونوں باتوں کو طاق پر رکھ دیا اور اختلاف کرنے والوں کے ساتھ ہر قسم کی بدسلوکی روا رکھی بلکہ اس پر فخر کیا۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں درج کرتا ہوں :-

۱۔ جب وہ ٹرین جس میں لیگ کے مخالف مسلمان قائدین سفر کر رہے تھے، علی گڑھ پہنچی تو یونیورسٹی کے مسلمان طلباء نے ان کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر ایسی نازیبا اور خلافِ تہذیب حرکات کیں جن کی وضاحت بذاتِ خود خلافِ تہذیب ہے اور اگر وضاحت بھی کی جائے تو کوئی شخص یقین نہیں کرے گا۔ کہ کوئی شریف آدمی ان حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے۔

---

[1] مراد ہیں سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب، واضح رہے کہ یہ تحریر آج سے کئی سال قبل کی ہے۔ [2] عزت مآب صاحب صدر بالقابہ کے اس خیال سے مجھے کلیۃً اتفاق نہیں ہے۔
(سلیم چشتی)

۲- جب حضرۃ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ سید پور ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو حامیانِ لیگ کا ایک انبوہ کثیر پلیٹ فارم پر جمع ہوگیا۔ ان لوگوں نے حضرت اقدسؒ کو گالیاں دیں اور جب حضرۃ موصوف پلیٹ فارم پر اترے تو مخالفین نے حضرۃؒ کو زمین پر گرانے کی کوشش کی اور گریبان پھاڑ دیا اور ایک شخص نے عمامہ سر سے اتار لیا اور پہلے اسے پاؤں سے روندا پھر نذرِ آتش کر دیا۔ (حیات شیخ الاسلام صفحہ ۲۲۲ تا صفحہ ۲۲۴)

میں نے دل پر جبر کر کے صرف دو واقعات درج کر دیئے ہیں۔ تفصیل سے عمداً اجتناب کیا ہے۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ اس زمانہ میں حامیان لیگ کی ذہنیت ایسی ہوگئی تھی کہ جو شخص ان سے سیاسی اعتبار سے اختلاف کرتا تھا اس کے ساتھ ہر بدسلوکی اور بے ادبی روا رکھی جاتی تھی بلکہ اُسے کارِ ثواب سمجھا جاتا تھا۔

آج جب بیس سال کے بعد ایک طرف ہمارے جوش اور ہیجان میں سکون کا رنگ پیدا ہوگیا ہے، اور دوسری طرف زندگی کے تلخ تر حقائق نے ہماری آنکھیں بھی کھول دی ہیں تو ہم پرانے مسلم لیگی، ان لوگوں کو رواداری کا اپدیش دے رہے ہیں جو اپنے سیاسی مخالفوں کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کے نامور صحافی میم شین نے (جسے میں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح عزیز رکھتا ہوں) اپنے ایک مضمون میں جو نوائے وقت مورخہ ۱۴ر نومبر ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا، مسلمانانِ پاکستان کو یہ مشورہ دیا تھا:

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم صیہونیت کے پروپیگنڈے کے زیر اثر انہیں (جمال عبد الناصر صدر جمہوریہ مصر) فرعون کی نسل کا علمبردار اور بھارت کے مقابلے میں پاکستان کا نقاد بنا کر اپنے لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ صدر ناصر عقائد کے لحاظ سے پکے اور سچے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمان ہی رہنے دینا چاہیئے۔"

سبحان اللہ! آج اس درسِ اخوت کی صداقت میں کس پاکستانی کو شک ہو سکتا ہے۔ لیکن میں بڑے بھائی کی حیثیت سے، اپنے پیارے میم شین سے پوچھتا ہوں کہ جب قوم پرور مسلمان (کانگرسی، جمعیتی اور احراری) زعمائے مسلم لیگ کی خدمت میں یہی حقیقت ثابتہ (یہی درسِ اخوت وانسانیت) بایں الفاظ پیش کیا کرتے تھے کہ:

"یہ سچ ہے کہ جمعیۃ العلماء اور مجلس احرار کے ارکان تقسیم ہند کے حامی نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ اس کو اپنی فراست مومنانہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے بہت مضر سمجھتے ہیں۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم لیگ کے پروپیگنڈا کے زیر اثر انہیں ہندوؤں کا حاشیہ بردار اور کفر کا علمبردار اور مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلموں کا حامی بنا کر اپنے (مسلمان) لوگوں کے سامنے پیش کرنا جاری رکھیں۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، اور مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی اور ان کے ہم خیال حضرات عقیدے کے اعتبار سے سچے اور پکے مسلمان ہیں اور ہمیں مسلمانوں کو مسلمان ہی رہنے دینا چاہیئے" تو کون سا مسلم لیگی ان کی اس معقول بات کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوتا تھا۔؟ یا ہو سکتا تھا۔؟ اس زمانے میں تو سیاسی اعتبار سے اختلاف کرنے والے مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کا یہ عالم تھا کہ جب الجمعیۃ علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر طلبہ کی گستاخی اور بدتہذیبی پر صدائے احتجاج بلند کی تو ڈان نے بڑے فخر کے ساتھ یہ لکھا تھا کہ گلدستوں کے بجائے ان لوگوں کے حصے میں اینٹ پتھر ہی آئیں گے؟

میرا مطلب اس تلخ نوائی سے صرف اس قدر ہے کہ اس زمانے میں ذہنیت ہی اس قسم کی ہو گئی تھی کہ ہم نے حفظ مراتب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور یہ راقم سیہ کار بھی اسی کشتی میں سوار اور اسی غلطی کا شکار تھا یعنی میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ جو مسلمان لیگ میں نہیں ہے وہ مسلمانوں کا خیر خواہ نہیں ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو علماء لیگ میں نہیں تھے۔ ان کی عظمت، وقعت، عزت اور منزلت میرے دل سے بالکل نکل گئی تھی۔ حالانکہ اب بیس سال کے بعد جب اس حماقت پر غور کرتا ہوں تو عرقِ ندامت میں غرق ہو ہو جاتا ہوں۔

جیسا کہ پہلے واضح کر چکا ہوں میں حضرت اقدسؒ کی طرف سے بدگمان تھا یعنی نفسِ امارہ کے پھندے میں گرفتار تھا۔ اسی لئے میں نے حضرت اقدسؒ کی شان میں گستاخی کا ارتکاب کیا۔ لہذا اب جبکہ حضرت اقدسؒ کی جلالت شان، للہیت، بزرگی اور بارگاہ رسالت میں ان کی قدر و منزلت مجھ پر آشکار ہو چکی ہے۔ اس لئے بصمیم قلب، انتہائی عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے اپنی خطا اور گستاخی کی معافی طلب کرتا ہوں، استغفار کرتا ہوں، توبہ کرتا ہوں، اظہارِ ندامت کرتا ہوں اور اس اعترافِ گناہ کو اس نیت سے شائع کرتا ہوں کہ قارئین میرے حق میں دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ میری توبہ کو قبول فرمائے اور میرے گناہوں کو معاف کر دے اور قیامت کے دن مجھ سے اس گستاخی پر مواخذہ نہ کرے جو میں نے اس کے مقرب بارگاہ بندے کی جناب میں روا رکھی تھی۔

(نامکمل)

★

ناظم دفتر اہتمام

احوال و کوائف

دارالعلوم

گورنر سرحد کی آمد مورخہ ۸ مارچ کو جناب حیات محمد خاں صاحب شیر پاؤ گورنر صوبہ سرحد دارالعلوم تشریف لائے۔ دارالعلوم سے باہر اساتذہ و طلبہ نے ان کا استقبال کیا۔ دارالعلوم پہنچ کر آپ نے حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ کے ساتھ درسگاہوں، کتب خانہ اور نئی تعمیرات کا معائنہ کیا اور بے حد متاثر ہوئے، کچھ دیر کیلئے آپ مولانا سمیع الحق صاحب ایڈیٹر الحق کے ساتھ دفتر الحق بھی تشریف لائے اور الحق سے اپنی دیرینہ دلچسپی اور تعلق کا اظہار فرمایا۔ بعد میں آپ حضرت شیخ الحدیث صاحب مدظلہ کے ساتھ دارالحدیث ہال تشریف لے گئے اور طلبہ کے ساتھ حلقہ درس میں چٹائیوں پر بیٹھ گئے۔ اس استقبالیہ مجلس میں مولانا سمیع الحق صاحب نے طلبہ و اساتذہ دارالعلوم کی طرف سے آپ کی اچانک آمد کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ حکام اور امراء کا ان بوریہ نشین طلبہ علوم نبوۃ کے پاس آنا خود ان کے حق میں عزت اور بھلائی کی بات ہے۔ جبکہ علماء اور فقراء کا حکام کے در پہ جبہ سائی علم اور دین کی تذلیل ہے۔ اس طرح آج جناب شیر پاؤ صاحب کی اچانک آمد اور طلبہ کی محفل میں بیٹھنے سے علم پرور حکام کی یاد تازہ ہو گئی ہے۔ جناب محترم گورنر صاحب نے مختصر خطاب میں فرمایا کہ میں حضرت مولانا مدظلہ کا دیرینہ معتقد ہوں۔ اور میں نے حضرت مولانا اور دارالعلوم کے بارہ میں جو کچھ سنا تھا آج دارالعلوم کو اپنی توقعات سے بہت بڑھ کر پایا۔ علوم دینیہ کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ ہمارا فرض ہے کہ پاکستان جس مقصد سے قائم ہوا ہے، اسے حاصل کرنے کے لئے ہم یہاں دین کے فروغ اور دینی تعلیم کی ترویج پر بھی پوری توجہ دیں۔ اس طرح اگر حکام ایک طرف کالجوں، یونیورسٹیوں میں جاتے ہیں تو دوسری طرف یہاں آکر طلبہ علوم دینیہ سے بھی ملنا چاہیئے کیونکہ یہ لوگ قیام پاکستان کے اساسی مقصد کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں جو کہ اسلام کی اشاعت و حفاظت ہے۔ بعد میں جناب گورنر صاحب موصوف نے دفتر اہتمام میں حضرت شیخ الحدیث مدظلہ

کے ساتھ چائے نوش فرمائی، اس موقع پر گورنر صاحب موصوف نے اپنی جیب سے دارالعلوم کو پانچسو روپیہ کا گرانقدر عطیہ دیا۔

قائد جمعیت کی تشریف آوری | قائد جمعیۃ العلماء اسلام حضرت مولانا مفتی محمود صاحب مدظلہ حسب معمول پچھلے ماہ بھی متعدد بار پشاور آتے جاتے دارالعلوم حقانیہ میں رونق افروز ہوئے طلبہ اساتذہ بالخصوص حضرت شیخ الحدیث مدظلہ سے حالات حاضرہ پر پُرلطف مجالس رہیں۔ ۹ر مارچ کو سہ جماعتی معاہدہ کی بخیر و خوبی تکمیل کے بعد راولپنڈی سے دارالعلوم تشریف لائے اور رات کو جامع مسجد میں ایک عظیم الشان اجلاس سے خطاب فرمایا۔

ضروری تصحیح | پچھلے ماہ ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کے مضمون مطالعاتی زندگی میں حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری قدس سرہٗ کے اسم گرامی کی جگہ سہو قلم سے محمد علی لکھا گیا ہے۔ قارئین تصحیح فرمائیں۔ (ادارہ)

بقیہ افکار و تأثرات | مضامین سے لوگوں کو یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ گویا یہ لوگ اب بھی اکھنڈ بھارت اور متحدہ ہندوستان بنانا چاہتے ہیں۔ اور دونوں ملکوں کو ایک ملک بنانا چاہتے ہیں۔" حالانکہ یہ قطعاً صحیح نہیں ہے۔ اور نہ کسی مسلمان کے ذہن میں یہ بات ہے۔ اب تو اس کا علاج صرف اور صرف اپنا استحکام استقلال اور اسلامی احکام کا مکمل نفاذ ہے۔ اسی میں ہندوستانی مسلمانوں کی حفاظت ہے۔ اسی میں اپنا وقار اور اسی سے مستقبل قریب میں پورے ہندوستان کو مسلم بنایا جا سکتا ہے۔ پاکستانی مذاکرات کی تاریخ میں غالباً یہ سہ فریقی مذاکرات میں پہلی دفعہ کامیابی سے ہمکنار ہوئے ہیں۔ اگر عبوری آئین کے مرحلہ پر بھی یہ چشم بد سے دور رہ جاتے ہیں، تو سرحد کی حد تک تو تاریخ کا یہ نیا باب ہوگا، مامورات شرعیہ کا اجراء اور منہیات الٰہیہ پر قدغن کیا خیال ہے سید شہیدؒ کی روح فرط مسرت سے جھوم نہیں اٹھے گی۔ کہ ھذا تاویل رؤیای من قبل قد جعلها ربی حقاً۔ والسلام

(مولانا عبدالکریم - کلاچی۔ ۲۷ر محرم ۱۳۹۲ھ)

> مختلف مدارس میں جہاں پڑھائی کیطرف طلباء کو متوجہ کیا جاتا ہے۔ وہاں یہ انتہائی ضروری ہے کہ لکھائی کیطرف بھی اسی اہمیت کے ساتھ زور دیا جائے۔ اور استاد صاحبان طلباء کو خوشخطی کے ساتھ ساتھ مختلف حروف اور الفاظ مثلاً ۃ اور ھ، ی اور ے، کے اور کہ کے صحیح استعمال کے متعلق مفصل بتائیں تاکہ جب وہ حصول تعلیم سے فارغ ہوکر مضمون نگاری کے میدان میں آئیں تو ان کی تحریر معمولی غلطیوں کی وجہ سے بے جان نہ ہو

شیخ المحدثین نصیر الدین الغورغشتوی رح

کتبہٗ الاحقر سمیع الحق خادم العلم بدار العلوم الحقانیہ و مدیر مجلۃ ـ الحق ـ اکوڑہ خٹک

★

شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین قدس سرہٗ کی سوانح کے بارہ میں یہ مختصر مضمون موصوف کے حاشیہ مشکوٰۃ شریف کی طبع ثانی کے لئے ناشر کتاب کی خواہش پر بطور دیباچہ لکھا گیا ہے۔ حضرت مرحوم کے تلامذہ اہل علم کا زیادہ تر تعلق افغان علاقوں سے ہے جن میں اکثر اردو زبان نہیں سمجھتے، ان کی دلچسپی کیلئے اسے الحق میں بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

★

اسرتہ ومولدہ هو الشيخ الاجل الزاهد المجاهد والمرشد الراشد نابغة العصر الثقة الثبت الفقيه بقية السلف آية من آيات الله شيخ الحديث مولانا نصير الدين بن مولانا بهاء الدين ابن مولانا سعد الدين ابن الشيخ محمد موسى بن اخوند محمد بشارتؒ آباءهم (من قبيلة كاكڑ الافاغنة) رحلوا من قندهار بنية الجهاد ضد الهنود ثم اقاموا في بلاد "چھچھ" وكان والد الشيخ عالماً نحريراً ورعاً شيخ طريقة الچشتية في زمانه توفي غرة جمادى الاولى سنة ۱۳۰۹ھ وكان سن الشيخ المحشي حينئذٍ اربع عشر سنةً فيظهر من ذلك ان الشيخ ولد في سنة ۱۲۹۵ھ ومولده غورغشتي مديرية "كيمبلپور" الواقعة في مقاطعة پنجاب ـ باكستان ـ ودامت ارض چھچھ موشحةً بازهار العلم والورع ولازالت متلألاةً بجواهر ثمينة كامثال الشيخ قطب الدين الغورغشتي والشيخ الاجل عبد الرحمان البهمبوري رح ومولانا سعد الدين الجلالوي رح وغير ذلك من اعلام العلم والفضل۔

دراسته تأثر الشيخ في اوائل حياته عن والده غاية التأثر نشأ في اسرة تحلت بخصائص العلم والتقوى وبحسن تربية الاسوة والوالد الحنون نشأ في العلم والعبادة واجهاد النفس وسهر الليالي وتحلى بمكارم الاخلاق زاهداً عن المظاهر

والدراسة - بدأ دراسته الابتدائية من اخيه الفاضل الشيخ شهاب الدين (وهو والد الشيخ الكبير قطب الدين من ارشد تلامذة فقيه العصر سيدنا رشيد احمد الگنگوهیؒ) ثم قرأ مبادئ النحو والصرف في بلدة "سروبة" مديرية "فتح جهنگ" واستكملها في قرية "لحه" ضواحی ملتان ثم رحل الى قرية "نوتهه" وتلمذ من الشيخ غلام رسول المعروف بـ "انی بابا" في كتب المنطق والمعاني ثم انتقل الى "چکوال" من منطقة ميانوالى وقرء الصحاح الستة من الشيخ الاجل قاضی قمر الدين المحدث الشهير وصاحب المدارج والمقامات (تلميذ الشيخ احمد حسن الامروهی من اجل تلامذة حجة الاسلام محمد قاسم النانوتویؒ) والشيخ القاضی استرشد في السلوك عن الشيخ خواجه محمد عثمان الدامانی صاحب الطريقة المجددية بموسیٰ زئی واستجاز في الصحاح عن الشيخ الاجل احمد علی السهارنفوری -

تدریسه | بعد فراغه من الدراسة وقف حياته لخدمة العلم ودرس العلوم والفنون وبلغ اوج الكمال في العلوم الآلية ولكن الله اصطفاه لحديث نبيه الكريم ذلك فضله يؤتيه من يشاء ولبعد برهة من الزمان سافر الى رنگون عاصمة برما يدرس اعواماً متفرقة ويطالع في مدرسة بجوار المسجد الجامع وفي هذا السفر سافر من "رنگون" الى الحج والزيارة في عهد الحرب العالمية الاولى وخلافة السلطان عبد الحميدؒ وفي ذلك الوقت شاعت مظالم الروس وهاجر المسلمون الى الحرمين فاذا رأى الشيخ احوالهم المشعثة يتاثر شديداً ويبكی على مصائب المسلمين وفي عودته من رنگون نزل في ديوبند - لما كان يسمع من محاسنه كثيراً ويزداد قلبه شوقاً الى ان يلتحق بمعهد الاسلام ويتشرف بتلمذ شيخ العالم محمود الحسن الديوبندیؒ فحضر في خدمته لاختبار الالتحاق بالمدرسة في الترمذی وهداية اخيرين وتوضيح تلويح فاعترف الشيخؒ بذكاءه التام واستعداده الكامل ومكث اسابيع في ديوبند ولما وجد الجو غير مساعد لصحته رجع الى بلدته غورغشتی وظل يدرس مشكوٰة المصابيح و امهات الكتب من علم الحديث والتفسير والفقه وينشر السنن النبوية زهاء نصف قرن الى وفاته حتى اختلط حب الحديث واختلاطه به بلحمه ودمه وصار لقبه "شيخ الحديث" علماً عليه اشهر من اسمه وجمعت اليه الطلبة من اقصى البلاد والاقطاع الاسلامية وصار

درس حديثية مالا مثل له في الهند الا بدار العلوم الديوبندية حيث يدرّس شيخ العرب والعجم مولانا حسين احمد المدني قدس سره العزيز ويحبّب التلامذة كالمهم افلاذ كبده وفي آلاف من تلامذته كبار العلم والمشيخة لم يكتفوا بتحصيل العلوم الظاهرية فقط بل استرشدوا منه في السلوك والارشاد واستكمال مدارج السلوك وكثيرٌ منهم فازوا بخلعة الخلافة في الطريقة النقشبندية والاجازة في علوم الحديث منهم مدرّسون وقضاة وحكام امتازوا بمزايا من اتباع السنة وانكار البدع مع حرمة السلف وقد تشرفني لمّا سألته تبركاً بالاجازة المسندة لسائر كتب الحديث فكتب في ورقة السند وانى حصل لى الاجازة والقرأة من شيخنا ومولانا القاضي قمر الدين الچكڑالوى وحصل له الاجازة من مولانا وشيخ مشائخنا احمد على السهارنفورى وحصل له الاجازة من مولانا شاه محمد اسحٰق الدهلوى ــــ فهذا يدل ان سنده اخصر واقصر الاسناد المتداولة في بلادنا۔

البيعة والاجازة | اجازة الشيخ حسين على (وان بچهراں) في طرق التصوف المجاز من خواجه محمد عثمان الداماني صاحب الفوائد العثمانية وكان الشيخ حسين على من ابطال الاسلام في ردّ البدع ودعوة التوحيد التي غلبت على سائر احواله وكيفياته وصار الشيخ نصير الدين قرة عين لشيخه ومحبّباً اليه صاحبه مدة طويلة ثم يرددالى زيارته طيلة حياته وكان يقول مرشده "نصير الدين هدية اهدى بها الى ربي ان استقدماني عزجلاله" -

ضحاياه وجهوده | كان مصداق قوله تعالى - لايخافون في الله لومة لائم ــــ ينقد دائماً على المنكرات مضطربًا لاعلاء كلمة الله وكبتِ اعداء الدين فحياته المباركه مصبوغة بصبغ الحسينية عليه سيما الجهاد دليلاً على جبينه كانه سيفٌ مسلولٌ - لادماغ الباطل ادخل السجن في حركة ختم النبوت - ضد القاديانية - مع ضعفه ومكث طويلاً في معتقل لاهور وساهيوال وغير ذالك مع رفقته من العلماء والمشائخ كان مشغلة في السجن الذكر والمراقبة والشيخ يقولُ اذا كان خارج السجن درس الحديث نفي السجن "الله الله - خير شغلي وخير جليس" كذالك ينكر على الفرق الباطلة و وخاصة الحركة المودودية و يقول ان فيها ضالٌ ومضلٌ ولا يجوز الصلوٰة خلف من

ينتمي اليها. ولسيعى دائما لاجراء الاحكام والقوانين الشرعية في باكستان وتوييد جمعية العلماء في تلك الاهداف ومع ضعفه ليسافر الى حفلات المدارس الدينية وارشاد الخلق

مزاياه ومن الله عليه | ومن منته تعالى عليه ان نشر الحديث بيديه في البلاد الغربية الى ماوراء النهر بعد ان اندرست آثاره واضمحل صيته، تحت الفلسفة والمعقول فحول الله انظار العلماء في البلاد الافغانية الى الحديث بجهوده المباركة فلولا عنايته بعلوم الحديث لقضى عليها بالزوال فالحق ان منزلته في بلاد وسط آسيا كمنزلة الشيخ ولى الله الدهلوي الامام، محي السنة في الهند ومن مزاياه الاخلاص والخلوص الذي هو روح العبادة فهذا العمل روح اعماله وجهوده ما اخذ اجراً قط على درس الحديث ولا اراد السمعة وما طلب المنصب ولا رضى برياسة اكبر المدارس ومشيخة المعاهد يدرس في المسجد او في ظل الاشجار لاطلب ولا من، متطوعاً محتسباً على الله فاغناه عن الاشتغال بالتكسب والاجرة وتزوده التوكل والاعتماد على ذاته واعطاه الله القبولية والمحبوبية ما يجعله لعباده المخلصين ومن من الله عليه ان اعطاه الله حظاً وافراً من الاعتدال والحكمة في المسائل الخلافية فلا يعيره فقد ونقير ولا تطهير مسلك السنة والجماعة ومن مزاياه شدة تصلبه في الدين وانتصاره لفقه ابي حنيفة يؤيدها بالدلائل مع احترام ائمة الفقه ومن مزاياه علو الهمة في العبادة واحياء الليالي بالتلاوة والصلوة والمطالعة ومن مزاياه حسن منظره اذا رئيته تذكر الله وتقشعر قلبك من خشية الله يجذبك كانه مغناطيس القلوب عليه سيما النور كانه ملك نزل من السماء خاشعاً متواضعاً في تكلمه ومشيته وزاهداً في مسكنه ومطعمه۔

حاشية على مشكوٰة | ومن مآثره المباركة هذه الحاشية ماتدل على تفقهه وتعمقه في مع وجازته واختصاره يغني العالم والمتعلم من الشروح المتداولة فقد جمع بين الرواية والدراية كانه سلالة المبسوطات فالحاشية ماثرة علمية مملؤة ببدائع فرائده ودرر فوائده لاسيما حواشي الفصل الثالث من المشكوٰة لان احاديثه قلما توجد في شروح الصحيحين واكثر الجوامع. وهذا مع انه لايكتب بيديه بل يمليه على الكاتب ثم يصحح واعتمد غالباً على شرح المشكوٰة لعلى القاريؒ ولكن الاسف ان الحواشي ما طبعت في ثوب رشيق يليق بشانه مازال الشيخ يقوم باداء الخدمات الهامة والذكر

والعبادة والدعوة والارشاد رغم شیخوختہ وامراضہ حتی استولت اشواق الحج والزیا
علی مشاعرہ تتہیا الی زیارت بیت اللہ یا بالباخرة مع وفور شوقہ الی اللہ ممن کان
یدعوالہ بطول الحیات ینکر علیہ ویتمنیٰ موت الحرمین وان لا یرجع ولکن اللہ رحم
جثتہ الطاہرة الصحیفة فتشرفہ بلقاءہ دون لقاء البیت ودعاہ الی رحمتہ راضیا مرضیا
بعد حیاة حافلة وذالک یوم الخمیس ۴ر ذی القعدہ ۱۳۸۸ھ ۲۳ر جنوری ۱۹۶۸ء بمستنگ
"واہ" ثم انتقل جثمانہ الی غورغشتی وصلی علیہ بعد صلوٰة الجمعة خامس ذی القعدہ
آلاف من العلماء والصلحاء والمسلمین بزفرات وعبرات علی العلم والھدی وکان لجنازتہ
منظرا لا نحو ما لم یرہ العیون فی تلک البلاد ودفن فی الناحیة الجنوبیة من البلدة
قربہ ضریح الشیخ قطب الدینؒ -
وکان وداعہ کما قال الشیخ الامام محمد انور الکشمیریؒ فی رثاء شیخہ شیخ الھند
قدس سرہ ؎

مررنی نعشہ فوق الرقاب وطالما | سری علمہ فوق الرکاب ورفعا
وشیعہ المخلوق من کل جانب | فلم ار الا المفضل کان مودعا
ولم ار مثل الیوم کم کان باکیا | وما کان و مع القوم دمعا مضیعا

اللھم اعظم اجرہ ولا تفتنا بعدہ ؎

لقد بذل المجھود حتی حیاتہ | لخدمة دین اللہ یا آ بکلکل

ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور کا سیرت النبی نمبر

ربیع الاول کے پہلے عشرہ میں شائع ہوگا جس میں اکابر علماء اسلام کے علاوہ
مسلم وغیر مسلم شعراء کے تاثرات بھی پیش کئے جائیں گے۔ خوبصورت پانچ
رنگا ٹائیٹل - صفحات ۱۵۰ - قیمت -/۳ روپے۔ سالانہ خریدار مبلغ -/۱۵ روپے
بھیج کر آج ہی اپنی کاپی محفوظ کریں۔

ناظم دفتر ہفت روزہ ترجمان اسلام چوک رنگ محل لاہور